زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

ماہنامہ

اشراق

فروری 2025ء

مدیر: سید منظور الحسن

مدیر آڈیو: محمد حسن الیاس

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

اشراق

ماہنامہ

جلد ۳ شمارہ ۲ فروری ۲۰۲۵ء شعبان ۱۴۴۶ھ

زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

مدیر

سید منظور الحسن

مدیر آڈیو اشراق: محمد حسن الیاس

معاون مدیر: شاہد محمود

مجلس تحریر:

ریحان احمد یوسفی، ڈاکٹر عمار خان ناصر، ڈاکٹر محمد عامر گزدر

ڈاکٹر عرفان شہزاد، محمد ذکوان ندوی، نعیم بلوچ

فہرست

شذرات

علم واستدلال — جاوید احمد غامدی — 3

رؤیتِ باری تعالیٰ—غامدی صاحب کا موقف — سید منظور الحسن — 6

قرآنیات

البیان: البقرہ 2: 233-242 (18) — جاوید احمد غامدی — 17

معارف نبوی

احادیث — جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس — 21

مقامات

ایمان بالغیب — جاوید احمد غامدی — 23

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

دین و دانش

شق القمر: غامدی صاحب کا موقف (19) — سید منظور الحسن — 25

آثارِ صحابہ

اہل بیت کرام کی تعظیم و توقیر (5) — ڈاکٹر عمار خان ناصر — 31

نقطۂ نظر

فکر غامدی: چند اعتراضات کا جائزہ — ڈاکٹر عرفان شہزاد — 40

'کلمۂ اسلام' کی عظمت — محمد ذکوان ندوی — 49

مختارات

فراہی سیمینار میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کا خطاب — سید ابوالحسن علی ندوی — 51

'اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ' کی شان نزول کی تحقیق (3) — علامہ شبیر احمد ازہر / غطریف شہباز ندوی — 60

کیا ہم نے کبھی غور کیا؟ — ثاقب علی — 67

مکالمات

مطالعۂ سنن ابن ماجہ (2) — ڈاکٹر عمار خان ناصر / ڈاکٹر سید مطیع الرحمن — 70

دین میں ڈاڑھی کا تصور (2) — محمد حسن الیاس / شاہد رضا — 81

سیر و سوانح

حیاتِ امین (18) — نعیم احمد بلوچ — 89

سید سلیمان ندوی: "شذرات سلیمانی" کے آئینے میں — محمد امین — 97

ادبیات

رہتی ہے اگر گردشِ دوراں کوئی دن اور — جاوید احمد غامدی — 106

حالات و وقائع

خبر نامہ "المورد امریکہ" — شاہد محمود — 107

جاوید احمد غامدی

علم و استدلال

انسان کے لیے اُس کے علم کا موضوع دو ہی چیزیں ہو سکتی ہیں: ایک، نفس اور دوسرے، مادہ۔ پھر اِن کے مظاہر پر غور کیجیے تو وہ بھی دو ہی صورتوں میں نمایاں ہوتے ہیں: ایک، شے اور دوسرے، اُس میں قوت کا ظہور۔ اسم اور فعل کے الفاظ دنیا کی تمام زبانوں میں اِسی حقیقت کو بیان کرتے، اور اِسی بنا پر اُن کے قواعد کی بنیاد قرار پاتے ہیں۔ اِن کو سمجھنے کے لیے جو ملکہ انسان کو عطا ہوا ہے، اُسے ہم عقل سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہی انسان کا اصلی شرف ہے۔ اِس کو جو ذرائع نفس اور مادہ، دونوں تک پہنچنے کے لیے میسر ہیں، اُنھیں حواس کہا جاتا ہے۔ عقل کے لیے اِن کی حیثیت گویا باب العلم کی ہے۔ یہ حواس جس طرح ظاہری ہیں، اُسی طرح باطنی بھی ہیں۔ ظاہری حواس انسان کی عقل کو مادے سے متعلق کرتے اور باطنی نفس کے ساتھ اُس کے ربط و تعلق کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اِس سے جو حقائق انسان کے علم میں آتے ہیں، اُن کے لیے کسی استدلال کی ضرورت نہیں ہوتی، گویا آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ اِسی بنا پر اُنھیں وجودی حقائق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انسان کے علم کی ابتدا اِنھی حقائق کے ادراک سے ہوتی ہے۔

یہ ادراک علم کس طرح بنتا ہے، اِس کی وضاحت ہم اِسی کتاب* میں پیچھے ”علم کی بنیاد“ کے زیر عنوان کر آئے ہیں۔ انسان کی عقل جب اِس علم سے بہرہ یاب ہوتی، اور اِن وجودی حقائق کا ادراک کر لیتی ہے تو اِس سے آگے معلوم سے نامعلوم تک پہنچنے کا سفر شروع کر دیتی ہے۔ اِسی کو استدلال کہا جاتا ہے۔ ادراک کے بعد یہ علم کا دوسرا ذریعہ ہے۔ یہ استدلال جب انسان کی شعوری ساخت میں موجود اضطراری علم کے حقائق کو بنائے استدلال بنا کر کیا جاتا ہے تو اِس کا نتیجہ بعض دوسرے حقائق کا وجوب ہے، جیسے اثر ہے تو موثر بھی ہے اور فعل ہے تو فاعل بھی ہے، یا فعل میں جن صفات کا ظہور ہوا ہے، وہ فاعل میں بھی لازماً ہونی چاہییں۔ اور جب متخیلہ کی بنا پر کیا جاتا ہے تو علم کی نئی دنیاؤں کے امکانات کا دفتر کھول دیتا ہے۔ علم کے تمام مفروضات، خواہ وہ نفسی علوم ہوں، یا سائنس اور عمرانیات، سب اِسی سے پیدا ہوتے اور ردو قبول کے مراحل سے گزرتے ہیں۔

پھر یہی نہیں، اِس کا حاصل بھی بہت غیر معمولی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ انسان کی عقل جب نفس کے اعماق میں اتری تو ملکۂ بلقیس کا تخت چشم زدن میں یمن سے اٹھا کر یروشلم پہنچا دیا گیا اور مادے کے اعماق میں اتر کر ذروں کا دل چیر لینے میں کامیاب ہوئی تو ہمارے وجود کی شبیہ ایک زندہ وجود کی طرح ہر گھر اور ہر مجلس میں پہنچا دی گئی، یہاں تک کہ ہمارے ہی بنائے ہوئے آلات ہمارے لیے معلم بن کر کھڑے ہو گئے۔

یہ سب ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا، مگر نہیں کہا جا سکتا کہ اِس عروس ہزار شیوہ کو ابھی اور کیا کرشمے دکھانے ہیں، جو جلد یا بدیر اِسی طرح منصۂ عالم پر نمودار ہو جائیں گے۔

تاہم اِس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ نفس اور مادے کی اِس دنیا سے آگے بھی اِس کے لیے رسائی کا کوئی امکان ہے۔ ہرگز نہیں، اِس کی جولان گاہ یہی دنیا ہے، جس کے حدود قرآن نے ’اَقْطَارُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ‘ کے الفاظ سے متعین کر دیے ہیں۔ اِس لیے اِس سے آگے نہ ادراک کے لیے کوئی جگہ ہے، نہ استدلال کے لیے۔ نفس اور مادے کی دنیا سے ماورا پرواز کی خواہش ہو تو اِس کے لیے ’سلطان‘ (پروانہ) چاہیے اور وہ صرف خداوند عالم کی بارگاہ ہی سے میسر ہو سکتا ہے:

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ ”اے گروہ جن وانس، زمین اور آسمانوں

---

* مقامات۔

اَنۡ تَنۡفُذُوۡا مِنۡ اَقۡطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ فَانۡفُذُوۡا، لَا تَنۡفُذُوۡنَ اِلَّا بِسُلۡطٰنٍ، فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ.

(الرحمٰن 55:33-34)

کی سرحدوں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ دیکھو۔ نہیں بھاگ سکتے، اِس کے لیے پروانہ چاہیے۔ پھر تم اپنے رب کی کن کن شانوں کو جھٹلاؤ گے!‘‘

سید منظور الحسن

رؤیتِ باری تعالیٰ ــ غامدی صاحب کا موقف

سورۂ نجم کے الفاظ 'ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی. فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی' (پھر وہ قریب ہوا اور جھک پڑا، یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اُس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا) اور واقعۂ معراج کی مذکورہ روایت کے الفاظ 'ودنا للجبار رب العزة، فتدلی، حتی کان منه قاب قوسین أو أدنی' (پھر اللہ رب العزت نے نزول فرمایا اور آپ کے قریب ہوئے، یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اُس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا) سے رؤیتِ باری تعالیٰ، یعنی دیدارِ الٰہی کا مفہوم اخذ کیا جاتا ہے۔ سورہ اور روایت کے متعلقہ اجزا درجِ ذیل ہیں:

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی. مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی. وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی. اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی. عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی. ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰی. وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی. ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی. فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی. فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰی. مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی. اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی. (53:1-12)

"تارے گواہی دیتے ہیں، جب وہ گرتے ہیں کہ تمھارا رفیق نہ بھٹکا ہے، نہ بہکا ہے۔ وہ اپنی خواہش سے نہیں بولتا، یہ (قرآن) تو ایک وحی ہے، جو اُسے کی جاتی ہے۔ اُس کو ایک زبردست قوتوں والے نے تعلیم دی ہے، جو بڑا صاحبِ کردار، بڑا صاحبِ حکمت ہے۔ چنانچہ وہ نمودار ہوا، اِس طرح کہ وہ آسمان کے اونچے کنارے پر تھا۔ پھر قریب ہوا اور جھک پڑا، یہاں تک کہ دو

کمانوں کے برابر یا اُس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا۔ پھر اللہ نے وحی کی اپنے بندے کی طرف جو وحی کی۔ جو کچھ اُس نے دیکھا، وہ دل کا وہم نہ تھا۔ اب کیا تم اُس چیز پر اُس سے جھگڑتے ہو، جو وہ آنکھوں سے دیکھ رہا ہے؟''

ثم علا به فوق ذلك بما لا يعلمه إلا الله، حتى جاء سدرة المنتهى، ودنا للجبار رب العزة، فتدلى، حتى كان منه قاب قوسين او ادنى، فاوحى الله فيما اوحى إليه خمسين صلاةً على امتك كل يوم وليلة. (بخاری، رقم 7517)

''پھر جبریل آپ کو اِس (ساتویں آسمان) سے بھی اوپر اُن بلندیوں کی طرف لے گئے، جنھیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، یہاں تک کہ آپ سدرۃ المنتہیٰ پر پہنچ گئے۔ پھر اللہ رب العزت نے نزول فرمایا اور آپ کے قریب ہوئے، یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اُس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا۔ پھر اللہ نے آپ کو وحی کی اور اُس میں ہر روز و شب میں پچاس نمازوں کا حکم دیا گیا، جو تمھاری امت پر فرض ہوئیں۔''

اِن سے رؤیتِ باری تعالیٰ کا مفہوم اخذ کرنے کے حوالے سے علما کے دو گروہ ہیں:

ایک گروہ کا موقف ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے دیدارِ الٰہی کا تصور قائم کرنا درست نہیں ہے۔ یہ تصور اُن آیات اور احادیث کے خلاف ہے، جو اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کے امکان کو رد کرتی ہیں۔ لہٰذا وہ سورۂ نجم کے مذکورہ مقام کو حضرت جبریل علیہ السلام کی رؤیت پر محمول کرتے ہیں۔ جہاں تک روایت کا تعلق ہے تو چونکہ اُس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر لفظاً آ گیا ہے، اِس لیے اُن میں سے بعض روایت کے متعلقہ حصے کو اور بعض پوری روایت کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں۔

اِس موقف کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بالتفصیل بیان کیا ہے۔ ''تفہیم القرآن'' سے سورۂ نجم کی تفسیر کے چند اجزا درج ذیل ہیں:

''زبردست قوت والے' سے مراد بعض لوگوں کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، لیکن مفسرین کی عظیم اکثریت اِس پر متفق ہے کہ اِس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عائشہ، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم، قتادہ، مجاہد، اور ربیع بن انس سے یہی قول منقول ہے۔ ابنِ جریر، ابنِ کثیر، رازی اور آلوسی وغیرہ حضرات نے بھی اِسی قول کو اختیار کیا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحب اور مولانا اشرف علی صاحب نے بھی اپنے ترجموں میں اِسی کی پیروی کی ہے۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ خود قرآنِ مجید کی دوسری تصریحات سے بھی یہی ثابت ہے۔...

یہ جبریل علیہ السلام سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری ملاقات کا ذکر ہے، جس میں وہ آپ کے سامنے اپنی اصلی صورت میں نمودار ہوئے۔ اس ملاقات کا مقام ''سدرۃ المنتہیٰ'' بتایا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ فرمایا گیا ہے کہ اِس کے قریب ''جنت الماویٰ'' واقع ہے۔...

یہ آیت اِس امر کی تصریح کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کو نہیں، بلکہ اُس کی عظیم الشان آیات کو دیکھا تھا۔ اور چونکہ سیاق وسباق کی رو سے یہ دوسری ملاقات بھی اُسی ہستی سے ہوئی تھی، جس سے پہلی ملاقات ہوئی، اِس لیے لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ افق اعلیٰ پر جس کو آپ نے پہلی مرتبہ دیکھا تھا، وہ بھی اللہ نہ تھا، اور دوسری مرتبہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جس کو دیکھا وہ بھی اللہ نہ تھا۔ اگر آپ نے اِن مواقع میں سے کسی موقع پر بھی اللہ جل شانہ کو دیکھا ہوتا تو یہ اِتنی بڑی بات تھی کہ یہاں ضرور اِس کی تصریح کر دی جاتی۔...

اِن وجوہ سے، بہ ظاہر اِس بحث کی کوئی گنجایش نہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اِن دونوں مواقع پر اللہ تعالیٰ کو دیکھا تھا یا جبریل علیہ السلام کو؟ لیکن جس وجہ سے یہ بحث پیدا ہوئی، وہ یہ ہے کہ اِس مسئلے پر احادیث کی روایات میں اختلاف پایا جاتا ہے۔...

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی ایک روایت جو قصۂ معراج کے سلسلے میں شریک بن عبداللہ کے حوالہ سے امام بخاری نے کتاب التوحید میں نقل کی ہے،... سب سے بڑا اعتراض اِس پر یہ وارد ہوتا ہے کہ یہ صریح قرآن کے خلاف پڑتی ہے۔ کیونکہ قرآنِ مجید دو الگ الگ رؤیتوں کا ذکر کرتا ہے، جن میں سے ایک ابتداءً افق اعلیٰ پر ہوئی تھی اور پھر اس میں 'دَنَا

فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْاَدْنٰی' کا معاملہ پیش آیا تھا، اور دوسری سدرۃ المنتہیٰ کے پاس واقع ہوئی تھی۔ لیکن یہ روایت اِن دونوں رؤیتوں کو خلط ملط کر کے ایک رؤیت بنا دیتی ہے۔ اِس لیے قرآنِ مجید سے متعارض ہونے کی بنا پر اِس کو تو کسی طرح قبول ہی نہیں کیا جا سکتا۔''

(5/195-202)

حافظ صلاح الدین یوسف نے اپنی تالیف ''واقعۂ معراج اور اُس کے مشاہدات'' میں اُن علما کے اقوال کو جمع کر دیا ہے، جو باری تعالیٰ کی عدم رؤیت کے قائل ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''بعض روایات میں صرف حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے یہ مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ لیکن دوسری طرف حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے یہ بھی مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کو دل سے دیکھا ہے۔... گویا حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے آنکھوں سے دیکھنے کی اور دل سے دیکھنے کی، دونوں قسم کی روایات منقول ہیں۔ اِس لیے حافظ ابنِ کثیر کہتے ہیں:

'حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے مطلق رؤیت کی جو روایت مروی ہے، اُسے اُس روایت پر محمول کیا جائے گا، جس میں دل کے ساتھ دیکھنے کی تخصیص ہے اور جس نے اُن سے آنکھ سے دیکھنے کی روایت کی ہے، اُس نے بڑی عجیب بات کی ہے، اِس لیے کہ صحابہ سے اِس کی بابت کوئی چیز صحیح ثابت نہیں۔'

محقق عصر ناصر الدین البانی فرماتے ہیں:

'بہر حال حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے آیت نجم کی تفسیر رؤیتِ باری تعالیٰ کے ساتھ اُن سے ثابت ہے، لیکن اِس کے مقابلے میں اِس آیت کی وہ تفسیر جو ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے (بروایتِ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا) مرفوع ذکر کی ہے اُس سے زیادہ بہتر ہے۔ اِس لیے کہ موقوف (قولِ صحابی) کے مقابلے میں مرفوع (قولِ رسول) کا لینا واجب ہے۔...'

یہی بات حافظ ابنِ حجر نے بھی لکھی ہے:

'حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے مطلق دیکھنے کی روایات بھی ہیں اور دل کے ساتھ دیکھنے کی خاص روایات بھی۔ اِس لیے مطلق کو مقید (خاص روایات) پر محمول کرنا ضروری ہے۔'

بہر حال اِس تفصیل سے واضح ہے کہ شبِ معراج میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کا دیدار کیا،

نہ براہِ راست گفتگو کی اور نہ آپ کا 'دنو و تدلی' کا تعلق اللہ کے ساتھ ہوا، جس کا اظہار سورۂ نجم کی آیت کی تفسیر میں بعض لوگوں نے کیا ہے۔" (75-77، 84)

دوسرے گروہ کے اہل علم سورۂ نجم کے الفاظ 'ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی. فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی' (پھر قریب ہوا اور جھک پڑا، یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اُس سے کچھ کم فاصلہ رہ گیا) اور روایت کے مذکورہ حصے کو باہم موافق قرار دیتے ہیں، جن میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں دیدارِ الٰہی کی صراحت ہے۔ تاکید مزید کے لیے وہ اُن روایات کو بنائے استدلال بناتے ہیں، جن میں رؤیتِ باری کی تصریح کی گئی ہے۔ چنانچہ وہ نہ صرف دیدارِ الٰہی کو برحق مانتے ہیں، بلکہ قرآنِ مجید کی آیات 'لَا تُدْرِکُهُ الْاَبْصَارُ' اور 'وَمَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّکَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ' کی تاویل بھی اِنھی کو اصل مان کر کرتے ہیں۔

پیر کرم شاہ الازہری نے اپنی تفسیر "ضیاء القرآن" میں سورۂ نجم کے تحت اُن علما کے اقوال کو درج کیا ہے، جو رؤیتِ باری تعالیٰ کے قائل ہیں۔ اُن کا اقتباس درج ذیل ہے:

"خلاصۂ کلام کو علامہ نووی اِن الفاظ میں بیان کرتے ہیں: حاصل بحث یہ ہے کہ اکثر علما کے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شبِ معراج اللہ تعالیٰ کو اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھا اور اِس میں شک کی کوئی گنجایش نہیں۔...

علامہ سید محمود آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ اِن آیات کی تفسیر و تشریح سے فارغ ہونے کے بعد دیدارِ الٰہی کے بارے میں اپنی ذاتی رائے کو یوں بیان کرتے ہیں:

'اور میں یہ کہتا ہوں کہ سرورِ عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم اپنے ربِ کریم کے دیدار سے مشرف ہوئے اور حضور کو قربِ الٰہی نصیب ہوا۔ لیکن اِس طرح جیسے اُس کی شان کبریائی کے لائق ہے۔' (روح المعانی)

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے جب دریافت کیا جاتا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے رب کا دیدار کیا تو آپ جواب میں فرماتے: ہاں حضور نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا، ہاں حضور نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔ یہ جملہ اِتنی بار دہراتے کہ آپ کا سانس ٹوٹ جاتا۔ (روح المعانی)

مولانا سید انور شاہ صاحب اِس مسئلے پر مفصل بحث کرنے کے بعد رقم طراز ہیں:

'حضور صلی اللہ علیہ وسلم دیدارِ الٰہی سے مشرف ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اِس دولتِ سرمدی

سے آپ کو نوازا اور اپنے فضل و احسان سے عزت افزائی فرمائی۔ پس حضور نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا، حضور نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا، جس طرح امام احمد نے فرمایا ہے، مگر یہ دیدار ایسا تھا، جیسے حبیب اپنے حبیب کا دیدار کرتا ہے۔ نہ وہ آنکھیں بند کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور نہ اِس میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ ٹکٹکی باندھ کر روے دل دار کو دیکھتا رہے۔ اللہ تعالیٰ کے اِس فرمان کا یہی مفہوم ہے: ما زاغ البصر وما طغیٰ۔' (فیض الباری، شرح فتح الباری)

حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی نے ''اشعۃ اللمعات'' کی جلد چہارم میں اِس مسئلے کی تحقیق کرتے ہوئے اِسی قول کو پسند فرمایا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے دیدار کا شرف حاصل کیا۔'' (5/23-24)

خلاصہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام کے زمانے سے لے کر دورِ حاضر تک رؤیتِ باری تعالیٰ کے معاملے میں اختلاف قائم ہے۔ ایک گروہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کا قائل ہے اور دوسرا اُس کا انکار کرتا ہے۔

استاذِ گرامی جناب جاوید احمد غامدی کے نزدیک، قرآن وحدیث کی رو سے، یہ دونوں نقطہ ہاے نظر درست نہیں ہیں۔ اِن کے پیچھے ایک ہی غلطی کار فرما ہے۔ وہ غلطی یہ ہے کہ دونوں نے اسرا و معراج کے واقعات کو رؤیا ماننے سے انکار کیا ہے۔ یہ انکار سورۂ بنی اسرائیل کی آیت 60 کے واضح مطالب اور صحیح بخاری کی مذکورہ حدیث کے صریح الفاظ کے منافی ہے۔ اِن دونوں مصادر سے قطعی طور پر اِس امر کی صراحت ہوتی ہے کہ واقعۂ معراج بیداری میں نہیں، بلکہ نیند کے عالم میں اور رؤیا کی صورت میں پیش آیا تھا۔

سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:

...وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ....(60:17)	''...اور ہم نے جو رؤیا تمھیں دکھایا، اُس کو بھی ہم نے اِن لوگوں کے لیے بس ایک فتنہ بنا کر رکھ دیا...۔''

اور حدیث کے ابتدائی اور اختتامی الفاظ ہیں:

حتی اتوہ لیلۃً اخری فیما یری قلبہ، وتنام عینہ، ولا ینام قلبہ،	''یہاں تک کہ ایک دوسری رات کو وہ (دوبارہ) آئے۔ اُس وقت آپ صلی اللہ

وكذلك الانبياء تنام اعينهم ولا تنام قلوبهم.

علیہ وسلم کی کیفیت ایسی تھی کہ آپ کی آنکھیں تو سو رہی تھیں، مگر آپ کا دل نہیں سو رہا تھا۔ پیغمبروں کا معاملہ یہی ہوتا ہے کہ (نیند کے عالم میں بھی) اُن کی آنکھیں تو سو جاتی ہیں، مگر اُن کے دل نہیں سوتے۔"

واستیقظ وھو فی مسجد الحرام.

"اِس کے بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بیدار ہوئے تو مسجدِ حرام میں تھے۔"

چنانچہ غامدی صاحب کے نزدیک یہ امر بالکل قرین قیاس ہے کہ معراج کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے دیدار کا شرف حاصل ہوا ہو۔ بعض دیگر روایتوں سے بھی اِس کی تائید ہوتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رؤیا کے عالم میں اللہ تعالیٰ کی دید کا اعزاز حاصل کیا تھا۔ ترمذی میں ہے:

عن معاذ بن جبل رضی اللّٰہ عنہ، قال: احتبس عنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ذات غداۃ عن صلاۃ الصبح حتی کدنا نتراءی عین الشمس، فخرج سریعًا فثوب بالصلاۃ فصلی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وتجوز فی صلاتہ، فلما سلم دعا بصوتہ، فقال لنا: علی مصافکم کما انتم.

"معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں فجر کی نماز پڑھانے سے روکے رکھا، (یعنی آپ تشریف نہیں لائے اور ہم آپ کے انتظار میں نماز پڑھنے سے رکے رہے) قریب تھا کہ ہم سورج کو دیکھ لیں گے۔ (یعنی سورج طلوع ہونے کا وقت بہت قریب آ گیا)۔ پھر آپ تیزی سے واپس تشریف لائے اور لوگوں کو نماز کے لیے بلایا۔ پھر آپ نے نماز پڑھائی اور نماز کو

مختصر کیا۔ سلام پھیرنے کے بعد آپ نے آواز دے کر لوگوں کو بلایا اور فرمایا کہ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جایئے۔

ثم انفتل إلينا، ثم قال: أما إني ساحدثكم ما حبسني عنكم الغداة اني قمت من الليل فتوضات وصليت ما قدر لي، فنعست في صلاتي حتى استثقلت فإذا انا بربي تبارك وتعالى في احسن صورة.

پھر آپ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا: میں آپ کو وہ بات بتانا چاہتا ہوں، جس نے آج مجھے روک لیا تھا۔ میں رات کو اٹھا، پھر میں نے وضو کیا اور تہجد کی نماز ادا کی۔ اُتنی ہی جتنی میرے لیے مقدر تھی۔ پھر نماز ہی میں مجھے اونگھ آگئی، یہاں تک کہ میں گہری نیند سو گیا۔ یک بہ یک میں نے دیکھا کہ میں اپنے پروردگار کے ساتھ ہوں اور وہ بہترین صورت پر ہے۔

فقال: يا محمد، قلت: لبيك رب، قال: فيم يختصم الملا الاعلى؟ قلت: لا ادري، قالها ثلاثًا، قال: فرايته وضع كفه بين كتفي حتى وجدت برد انامله بين ثديي، فتجلى لي كل شيء وعرفت.

(رقم 3235)

اُس نے فرمایا: اے محمد، میں نے عرض کیا: میرے رب، میں حاضر ہوں۔ اُس نے فرمایا: کیا آپ جانتے ہیں کہ ملاے اعلیٰ کے لوگ کس بات پر بحث کر رہے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ میں نہیں جانتا؟ اللہ تعالیٰ نے یہ بات تین بار پوچھی۔ پھر آپ نے فرمایا کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔ اُس نے اپنا ہاتھ میرے شانوں کے درمیان رکھا اور میں نے اُس کی انگلیوں کی ٹھنڈک اپنے سینے کے اندر محسوس کی۔ اِس کے ساتھ ہی ہر چیز

میرے سامنے روشن ہو کر آ گئی اور میں
جان گیا۔‘‘

استاذِ گرامی کے نزدیک معراج کی روایت میں چونکہ بہ صراحت مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ذاتِ باری کا مشاہدہ رؤیا کے عالم میں کیا تھا، اِس لیے اُس کو قرآنِ مجید کے اُن نصوص کے خلاف قرار نہیں دیا جا سکتا، جو باری تعالیٰ کی رؤیت بصری کے امکان کو رد کرتے ہیں۔ مزید برآں، اسرا و معراج کے مشاہدات کو—قرآن و حدیث کے صریح الفاظ کے مطابق—عالم رؤیا کے مشاہدات پر محمول کرنے کے نتیجے میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کی درجِ ذیل روایت بھی پوری طرح واضح ہو جاتی ہے اور اِس میں اور رؤیتِ باری کی روایتوں میں تصور کیا جانے والا تناقض بھی رفع ہو جاتا ہے:

عن مسروق، قال: كنت متكئًا عند عائشة، فقالت: يا ابا عائشة، ثلاث من تكلم بواحدة منهن، فقد اعظم على الله الفرية، قلت: ما هن؟ قالت: من زعم ان محمدًا صلى الله عليه وسلم راى ربه، فقد اعظم على الله الفرية.	’’مسروق بیان کرتے ہیں کہ میں سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ٹیک لگائے ہوئے بیٹھا تھا۔ سیدہ نے کہا: اے ابو عائشہ، (یہ مسروق کی کنیت ہے) تین باتیں ایسی ہیں کہ جو اِن کا قائل ہوا، اُس نے اللہ پر بڑا جھوٹ باندھا۔ میں نے پوچھا: وہ تین باتیں کون سی ہیں؟ اُنھوں نے کہا کہ (ان میں سے ایک یہ ہے کہ) کوئی یہ خیال کرے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا ہے، تو اُس نے اللہ پر بہت بڑا جھوٹ باندھا ہے۔
قال: وكنت متكئًا فجلست، فقلت: يا ام المؤمنين، انظريني ولا تعجليني، الم يقل الله عز و	مسروق نے کہا: میں ٹیک لگائے ہوئے (نیم دراز) تھا، (یہ سنتے ہی فوراً) اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر میں نے کہا: ام

جل: وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ[1] وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى.[2]

المومنین، ذرا ٹھیر جایئے اور جلدی نہ کیجیے۔ کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: 'وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ' اور 'وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى'۔

فقالت: انا اول هذه الامة، سال عن ذلك رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال: إنما هو جبريل، لم اره على صورته التى خلق عليها، غير هاتين المرتين، رايته منهبطًا من السماء، سادًا عظم خلقه ما بين السماء إلى الارض.

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: اِس امت میں سب سے پہلے میں نے اِن آیتوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ تو جبریل تھے (جن کا ذکر اِن آیتوں میں ہوا ہے)۔ میں نے اُنھیں اِن دو موقعوں کے علاوہ کبھی اُس صورت میں نہیں دیکھا، جس میں اللہ نے اُنھیں بنایا ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ آسمان سے اتر رہے تھے اور اُن کا وجود آسمان سے زمین تک پھیلا ہوا تھا۔

فقالت: اولم تسمع ان الله يقول: لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَ هُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ[3] اولم تسمع ان الله يقول:

پھر سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: کیا تو نے سنا نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: 'لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ ۫ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَاللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ'،

---

[1]۔ التکویر 81:23۔

[2]۔ النجم 53:13۔

[3]۔ الانعام 6:103۔

وَ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ.[4] (مسلم، رقم 457)

کیا تو نے سنا نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ’وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ.‘‘

[4] ۔ الشوریٰ 42:51۔

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(18)

وَ الۡوَالِدٰتُ یُرۡضِعۡنَ اَوۡلَادَهُنَّ حَوۡلَیۡنِ کَامِلَیۡنِ لِمَنۡ اَرَادَ اَنۡ یُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَ عَلَی الۡمَوۡلُوۡدِ لَهٗ رِزۡقُهُنَّ وَ کِسۡوَتُهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ لَا تُکَلَّفُ نَفۡسٌ اِلَّا وُسۡعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَ لَا مَوۡلُوۡدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَ عَلَی الۡوَارِثِ مِثۡلُ ذٰلِکَ ۚ فَاِنۡ اَرَادَا فِصَالًا عَنۡ تَرَاضٍ مِّنۡهُمَا وَ تَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡهِمَا ؕ وَ اِنۡ اَرَدۡتُّمۡ اَنۡ تَسۡتَرۡضِعُوۡۤا اَوۡلَادَکُمۡ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ اِذَا سَلَّمۡتُمۡ مَّاۤ اٰتَیۡتُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۲۳۳﴾

اور (طلاق کے بعد بھی) مائیں اُن لوگوں کے لیے جو دودھ کی مدت پوری کرنا چاہتے ہوں، اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں گی اور بچے کے باپ کو (اِس صورت میں) دستور کے مطابق اُن کا کھانا کپڑا دینا ہو گا۔ کسی پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ نہ کسی ماں کو اُس کے بچے کی وجہ سے نقصان پہنچایا جائے اور نہ کسی باپ کو اُس کے بچے کے سبب سے۔۔۔اور اِسی طرح

وَ الَّذِیۡنَ یُتَوَفَّوۡنَ مِنۡکُمۡ وَ یَذَرُوۡنَ اَزۡوَاجًا یَّتَرَبَّصۡنَ بِاَنۡفُسِہِنَّ اَرۡبَعَۃَ اَشۡہُرٍ وَّ عَشۡرًا ۚ فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَہُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ فِیۡمَا فَعَلۡنَ فِیۡۤ اَنۡفُسِہِنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ؕ وَ اللّٰہُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ خَبِیۡرٌ ﴿۲۳۴﴾ وَ لَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ فِیۡمَا عَرَّضۡتُمۡ بِہٖ مِنۡ خِطۡبَۃِ النِّسَآءِ اَوۡ اَکۡنَنۡتُمۡ فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ عَلِمَ اللّٰہُ اَنَّکُمۡ سَتَذۡکُرُوۡنَہُنَّ وَ لٰکِنۡ لَّا تُوَاعِدُوۡہُنَّ سِرًّا اِلَّاۤ اَنۡ تَقُوۡلُوۡا قَوۡلًا مَّعۡرُوۡفًا ۬ۙ وَ لَا تَعۡزِمُوۡا عُقۡدَۃَ النِّکَاحِ حَتّٰی یَبۡلُغَ الۡکِتٰبُ اَجَلَہٗ ؕ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ یَعۡلَمُ مَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ فَاحۡذَرُوۡہُ ۚ وَ اعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰہَ غَفُوۡرٌ حَلِیۡمٌ ﴿۲۳۵﴾

لَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ اِنۡ طَلَّقۡتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمۡ تَمَسُّوۡہُنَّ اَوۡ تَفۡرِضُوۡا لَہُنَّ فَرِیۡضَۃً ۖۚ وَّ مَتِّعُوۡہُنَّ ۚ عَلَی الۡمُوۡسِعِ قَدَرُہٗ وَ عَلَی الۡمُقۡتِرِ قَدَرُہٗ ۚ مَتَاعًۢا بِالۡمَعۡرُوۡفِ ۚ حَقًّا عَلَی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۲۳۶﴾ وَ اِنۡ طَلَّقۡتُمُوۡہُنَّ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تَمَسُّوۡہُنَّ وَ قَدۡ فَرَضۡتُمۡ لَہُنَّ فَرِیۡضَۃً فَنِصۡفُ مَا فَرَضۡتُمۡ اِلَّاۤ اَنۡ یَّعۡفُوۡنَ اَوۡ یَعۡفُوَا الَّذِیۡ بِیَدِہٖ عُقۡدَۃُ النِّکَاحِ ؕ وَ اَنۡ تَعۡفُوۡۤا اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی ؕ وَ لَا تَنۡسَوُا الۡفَضۡلَ بَیۡنَکُمۡ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِیۡرٌ ﴿۲۳۷﴾

کی ذمہ داری اُس کے وارث پر بھی ہے ـــــ پھر اگر دونوں باہمی رضامندی اور آپس کے مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور اگر تم اپنے بچوں کو کسی اور سے دودھ پلوانا چاہو تو اِس میں بھی تمھارے لیے کوئی مضایقہ نہیں، بشرطیکہ (بچے کی ماں سے) جو کچھ تم نے دینا طے کیا ہے، وہ دستور کے مطابق اُسے دے دو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو، اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔ 233

اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑیں تو وہ بھی اپنے آپ کو چار مہینے دس دن انتظار کرائیں۔ پھر جب اُن کی عدت پوری ہو جائے تو اپنے حق میں دستور کے مطابق جو کچھ وہ کریں، اُس کا تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے خوب جانتا ہے۔ اور تمھارے لیے اِس میں بھی کوئی گناہ نہیں جو تم اشارے کنایے میں نکاح کا پیغام اُن عورتوں کو دو یا اُس کو اپنے دل میں چھپائے رکھو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم اُن سے یہ بات تو کرو گے ہی۔ سو کرو، لیکن (اِس میں) کوئی وعدہ اُن سے چھپ کر نہ کرنا۔ ہاں، دستور کے مطابق کوئی بات، البتہ کہہ سکتے ہو۔ اور نکاح کی گرہ اُس وقت تک نہ باندھو، جب تک قانون اپنی مدت پوری نہ کر لے۔ اور جان رکھو کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ تمھارے دلوں میں ہے، اِس لیے اُس سے ڈرو اور جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا ہے، وہ بڑا بردبار ہے۔ 234-235

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿۲۳۸﴾ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۹﴾

وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾

وَ لِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾

اور اگر تم عورتوں کو اِس صورت میں طلاق دو کہ تم نے اُنھیں ہاتھ نہیں لگایا یا اُن کا مہر مقرر نہیں کیا تو مہر کے معاملے میں تم پر کچھ گناہ نہیں ہے، مگر یہ تو لازماً ہونا چاہیے کہ دستور کے مطابق اُنھیں کچھ سامان زندگی دے کر رخصت کرو، اچھی حالت والے اپنی حالت کے مطابق اور غریب اپنی حالت کے مطابق۔ یہ حق ہے اُن پر جو احسان کا رویہ اختیار کرنے والے ہوں۔ لیکن تم نے اگر طلاق تو اُنھیں ہاتھ لگانے سے پہلے دی، مگر اُن کا مہر مقرر کر چکے ہو تو مقررہ مہر کا نصف اُنھیں دینا ہو گا، الاّ یہ کہ وہ اپنا حق چھوڑ دیں یا وہ چھوڑ دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گرہ ہے۔ اور یہ تقویٰ سے زیادہ قریب ہے کہ تم مرد اپنا حق چھوڑ دو اور اپنے درمیان کی فضیلت نہ بھولو۔ بے شک اللہ دیکھ رہا ہے اُس کو جو تم کر رہے ہو۔236-237

(یہ خدا کی شریعت ہے۔ اِس پر قائم رہنا چاہتے ہو تو) اپنی نمازوں کی حفاظت کرو، خاص کر اُس نماز کی جو (دن اور رات کی نمازوں کے) بیچ میں آتی ہے، (جب تمھارے لیے اپنی مصروفیتوں سے نکلنا آسان نہیں ہوتا)، اور (سب کچھ چھوڑ کر) اللہ کے حضور میں نہایت ادب کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ پھر اگر خطرے کا موقع ہو تو پیدل یا سواری پر، جس طرح چاہے پڑھ لو۔ لیکن جب امن ہو جائے تو اللہ کو اُسی طریقے سے یاد کرو، جو اُس نے تمھیں سکھایا ہے، جسے تم نہیں جانتے تھے۔238-239

اور ہاں، (بیوہ اور مطلقہ کے بارے میں جو ہدایات تمھیں دی گئی ہیں، اُن سے متعلق یہ وضاحت ضروری ہے کہ) تم میں سے جو لوگ وفات پائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ رہے ہوں، وہ اپنی اُن بیویوں کے لیے سال بھر کے نان و نفقہ کی وصیت کر جائیں اور یہ بھی کہ (اِس عرصے میں) اُنھیں گھر سے نہ نکالا جائے۔ لیکن وہ خود گھر چھوڑ دیں تو جو کچھ دستور کی بات وہ اپنے معاملے میں کریں، اُس کا تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ (یہ اللہ کا قانون ہے) اور اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔240

اور (اِسی طرح یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ) مطلقہ عورتوں کو ہر حال میں دستور کے مطابق کچھ سامانِ زندگی دے کر رخصت کرنا چاہیے۔ یہ حق ہے اُن پر جو خدا سے ڈرنے والے ہوں۔ 241

اللہ اِسی طرح تمھارے لیے اپنی آیتوں کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم سمجھنے والے بنو۔ 242

[باقی]

ترجمہ و تحقیق: جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس

— 1 —

صفیہ بنت ابو عبید سے روایت ہے، وہ کہتی ہیں: میں نے عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے سنا، وہ بیان کرتے تھے کہ اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ آپ نے فرمایا: جو شخص کسی نجومی کے پاس جائے کہ اُس سے کوئی سوال پوچھے، اُس کی چالیس شب و روز کی نمازیں قبول نہیں کی جاتیں۔ (المعجم الاوسط، طبرانی، رقم 9405)

—2 —

زید بن خالد جہنی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیبیہ میں ہمیں صبح کی نماز پڑھائی۔ اُسی رات بارش ہوئی تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز سے فارغ ہو گئے تو لوگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: تم جانتے ہو کہ تمھارے پروردگار نے کیا کہا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: اللہ اور اُس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: (اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ) میرے بندوں میں سے کچھ نے میرے اوپر ایمان کے ساتھ صبح کی ہے اور بعض نے کفر کی حالت میں۔ سو جس شخص نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل اور اُس کی رحمت سے ہم پر بارش برسی، وہ میرے اوپر ایمان لایا اور تاروں کا انکار کیا۔ اور جس نے کہا کہ فلاں تارے کی وجہ سے ہمارے اوپر بارش برسی، اُس نے میرے ساتھ کفر کیا اور وہ تاروں پر ایمان لایا۔ (بخاری، رقم 804)

3

عکرمہ کہتے ہیں، میں نے ابو ہریرہ سے سنا، وہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ جب آسمان پر کسی چیز کا فیصلہ کرتا ہے تو فرشتے اُس کی بات کے امتثال میں سراپا عاجزی ہو کر اپنے پر مارتے ہیں۔ یہ اُس طرح کی آواز ہوتی ہے، جس طرح چکنے پتھر پر کوئی زنجیر کھینچی جائے۔ پھر جب اُن کے دلوں کی گھبراہٹ دور ہو جاتی ہے تو ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں: تمھارے پروردگار نے ابھی کیا فرمایا ہے؟ وہ جواب میں کہتے ہیں: اُس نے حق ہی فرمایا ہے اور وہ بلند مرتبہ ہے، بڑی شان والا ہے۔ پھر کوئی چھپ کر سننے والا اِس کو سن لیتا ہے اور یہ چھپ کر سننے والے اوپر نیچے ہوتے ہیں ـــــ سفیان نے اِس کی صورت اپنے ہاتھ سے اِس طرح سمجھائی کہ اُس کو جھکایا اور اُس کی انگلیاں پھیلا دیں ـــــ (فرمایا): وہ ایک اُس بات کو سنتا ہے اور سن کر نیچے والے کو القا کرتا ہے۔ پھر نیچے والا اُس سے نیچے والے کو، یہاں تک کہ وہ اُسے ساحر یا کاہن کی زبان پر القا کر دیتا ہے۔ اِس میں بارہا یہ بھی ہوتا ہے کہ القا سے پہلے ہی شہاب ثاقب اُسے پا لیتا ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ اُس کے پہنچنے سے پہلے وہ اُسے القا کر دیتا ہے۔ پھر وہ کاہن اُس کے ساتھ سو جھوٹ خود بولتا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ کیا فلاں فلاں دن اُس نے ہمیں اِس اور اِس طرح کی بات نہیں کہی تھی۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو بات اُس نے آسمان سے سنی تھی، اُس کی وجہ سے اُس کی تصدیق ہو جاتی ہے۔ (بخاری، رقم 4451)

مقامات غامدی

یہ مرا سرود کیا ہے؟ تری یاد کا بہانہ
کبھی علم کی حکایت، کبھی عشق کا فسانہ

جاوید احمد غامدی

ایمان بالغیب

ایمان بالغیب کے معنی یہ ہیں کہ وہ حقائق جو آنکھوں سے دیکھے نہیں جا سکتے، اُنھیں انسان محض عقلی دلائل کی بنا پر مان لے۔ ذات خداوندی کو ہم دیکھ نہیں سکتے؛ قیامت ابھی ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی ہے؛ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جبریل امین کو وحی کرتے ہم نے نہیں دیکھا، لیکن اِس کے باوجود ہم اِن سب باتوں کو مانتے ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِن حقائق کو ماننے کے لیے انفس و آفاق میں اور خود اُس کلام میں جو اللہ کے پیغمبر نے پیش کیا، ایسے قوی دلائل موجود ہیں جن کا انکار کوئی صاحب عقل نہیں کر سکتا۔

چنانچہ ہم اِنھیں بے سوچے سمجھے نہیں مانتے، بن دیکھے مانتے ہیں۔ وہ چیز جو دیکھی نہیں جا سکتی، لیکن عقل کے ذریعے سے سمجھی جا سکتی ہے، اُسے دیکھنے کا تقاضا ہی سب سے بڑی بے عقلی ہے۔ کتنی حقیقتیں اِس زمانے میں سائنس نے دریافت کی ہیں جنھیں ہم اپنے حواس کی گرفت میں نہیں لے سکتے، لیکن اِس کے باوجود اُسی طرح مانتے ہیں، جس طرح دوپہر چڑھے کھلے آسمان کے نیچے اِس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ سورج چمک رہا ہے اور اِس کی دھوپ ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ قرآن نے جو حقائق پیش کیے ہیں، اُن پر ہمارے ایمان کی بنیاد بھی یہی ہے۔ وہ، بے شک

حواس سے ماورا ہیں، لیکن عقل سے ماورا نہیں ہیں۔ ہم نے اُنھیں عقل کی میزان میں تولا ہے اور اُن میں رتی بھر کمی نہیں پائی۔ چنانچہ ہم اُن پر ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اُنھیں عقل و فطرت کے قطعی دلائل کی بنا پر مانتے ہیں۔ اِس بات پر اصرار نہیں کرتے کہ آنکھوں سے دیکھنے کے بعد ہی مانیں گے۔

[1987ء]

سید منظور الحسن

شق القمر

غامدی صاحب کا موقف

[محمد حسن الیاس کے ساتھ ایک مکالمے سے لیا گیا]

(19)

خلاصۂ مباحث

1۔ شق قمر کا واقعہ قرآنِ مجید میں سورۂ قمر (54) کی ابتدائی آیات میں بیان ہوا ہے۔ ارشاد ہے: 'اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً'، ''وہ گھڑی قریب آ گئی، جس سے اِنھیں خبردار کیا جا رہا ہے اور چاند شق ہو گیا۔ (مگر یہ نہ مانیں گے) اور خواہ کوئی آیت دیکھ لیں۔''

2۔ اِس سے واضح ہے کہ قرآنِ مجید نے اِس واقعے کو 'آیۃ' سے تعبیر کیا ہے۔

3۔ 'آیۃ' عربی زبان کا معروف لفظ ہے۔ اِس کے معنی علامت اور نشانی کے ہیں۔

4۔ یہ لفظ جب اللہ تعالیٰ کی نسبت سے بیان ہو تو اِس سے مراد انفس و آفاق کی وہ نشانیاں ہوتی ہیں، جو اُس کی مختلف صفات کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

5۔ قرآنِ مجید جب انسانوں کو اللہ کی صفات کے بارے میں توجہ دلانا چاہتا ہے تو وہ اِنھی

آیات کو بہ طورِ دلیل پیش کرتا ہے اور اِس طرح اُن کے لیے تذکیر و ترغیب، تہدید و تخویف اور تنبیہ و تعذیب کا سامان کرتا ہے۔

6۔ اِس اصطلاحی مفہوم میں یہ لفظ قرآنِ مجید میں چار مختلف اطلاقات کے لیے استعمال ہوا ہے:

i۔ انفس و آفاق میں معمول کے مطابق ظاہر ہونے والی آیاتِ الٰہی کے لیے ـــــ جو انفس و آفاق میں ظاہر و باہر ہیں اور جن کا تعلق اللہ کی قدرت کے عادی امور سے ہے۔ اللہ کا انسان کو مٹی کے خمیر سے تخلیق کرنا یا سورج اور چاند کو ایک قانون کا پابند کرنا یا آسمان سے پانی برسا کر مردہ زمین کے اندر زندگی پیدا کرنا اِسی نوعیت کی آیات ہیں۔

ii۔ انفس و آفاق میں معمول کے خلاف ظاہر ہونے والی آیاتِ الٰہی کے لیے ـــــ جو مافوق الفطرت اور خارقِ عادت ہیں اور اللہ کے براہِ راست حکم سے یا کارکنانِ قضا و قدر کے ذریعے سے واقع ہوتی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانۂ رسالت میں بنی اسرائیل پر من و سلویٰ اترنا، صحرائے سینا میں اُن پر مستقل بادلوں کا سایہ رہنا، حضرت مسیح علیہ السلام کا بن باپ کے پیدا ہونا اور گہوارے میں کلام کرنا اِسی کی مثالیں ہیں۔

iii۔ انفس و آفاق کی خلاف معمول ظاہر ہونے والی اُن آیاتِ الٰہی کے لیے ـــــ جو مافوق الفطرت اور خارقِ عادت ہیں اور اللہ کے حکم پر اُس کے نبیوں کے ذریعے سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اِنھی کو مذہبی اصطلاح میں ''معجزہ'' کہا جاتا ہے۔ اِس کے نظائر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا سانپ بننا، اُس کی ضرب سے بارہ چشموں کا پھوٹنا، حضرت مسیح علیہ السلام کا مردوں کو زندہ کرنا اور رسالت مآب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر کلام الٰہی کا جاری ہونا شامل ہیں۔

iv۔ انفس و آفاق میں حسبِ معمول اور خلافِ معمول ظاہر ہونے والی آیاتِ الٰہی کو بیان کرنے والی آیاتِ قرآنی کے لیے ـــــ جو قرآن کے بین الدفتین درج ہیں اور اُس کی سورتوں کے فقروں کے طور پر تلاوت کی جاتی ہیں۔

7۔ اب سوال یہ ہے کہ سورۂ قمر میں لفظِ 'آیۃ' مذکورہ چار اطلاقات میں سے کس اطلاق کو قبول کرتا ہے؟ اِس کے جواب میں اگر ہم اِسے قرآن کے جملے یا آیت کے مفہوم میں لینا چاہیں تو اِس کی کوئی گنجایش نہیں ہے، کیونکہ یہاں یہ لفظ کسی فقرے کے لیے نہیں، بلکہ واقعے کے لیے

استعمال ہوا ہے۔ اِسی طرح اگر اِس کا اطلاق انفس و آفاق کی معمول کے مطابق ظاہر ہونے والی نشانیوں پر کیا جائے تو یہ بھی درست نہ ہو گا، کیونکہ یہ معمول کا واقعہ نہیں ہے۔ معلوم انسانی تاریخ میں یہ واقعہ ایک ہی مرتبہ پیش آیا ہے۔ جہاں تک اُن آیات کا تعلق ہے، جو معجزات و خوارق کی صورت میں انبیا کے توسط سے ظاہر ہوتی ہیں تو اُن کے زمرے میں بھی اِس واقعے کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اِس میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا توسط اختیار نہیں کیا گیا۔ یعنی نہ آپ نے اپنی زبان سے کوئی الفاظ صادر فرمائے، نہ دستِ مبارک کے اشارے سے چاند کو دو ٹکڑے ہونے کا حکم دیا اور نہ اُس کی جانب کسی چیز کو پھینکا۔ ایسی کوئی صورت ہوتی تو بلاشبہ، اِس واقعے کا شمار اُن آیات میں ہوتا، جو اللہ کے اذن پر انبیا کے ہاتھ سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اب ایک ہی صورت باقی ہے کہ اِسے آیاتِ الٰہی کی اُس نوعیت پر محمول کیا جائے، جو خارقِ عادت تو ہے، مگر اللہ کی طرف سے براہِ راست ظاہر ہوئی ہے۔

8۔ چنانچہ درست تاویل یہی ہے کہ یہ واقعہ ایسی غیر معمولی نشانی ہے، جو اللہ کے براہِ راست حکم سے ظاہر ہوئی اور اِس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط کو اختیار نہیں کیا گیا، یعنی اِس کا شمار اُسی طرح کی نشانیوں میں ہوتا ہے، جیسی اِس سے پہلے بنی اسرائیل کے پیغمبروں کے زمانے میں ظاہر کی گئیں۔ اِن کی مثالیں من و سلویٰ کا اترنا، بدلیوں کا سایہ فگن ہونا، کوہِ طور کا معلق ہونا، سیدنا مسیح کا بن باپ کے تخلیق پانا ہیں۔

9۔ قرآنِ مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آخری رسالت کے زمانے میں بھی اِسی طرح کی نشانیاں دکھانے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ سورۂ حٰم السجدہ (41) میں اِن الفاظ میں بیان ہوا ہے:

> ”(تم مطمئن رہو، اے پیغمبر، اور یہ بھی متنبہ ہو جائیں)، اِنھیں ہم عنقریب اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور خود اِن کے اندر بھی، یہاں تک کہ اِن پر ظاہر ہو جائے گا کہ یہ قرآن بالکل حق ہے۔“ (53)

10۔ قرآن سے یہ بھی واضح ہے کہ شق قمر کی نشانی کفارِ قریش کے لیے تھی اور اِس کا مقصد اُنھیں ’الساعۃ‘، یعنی قیامت کی گھڑی کے بارے میں متنبہ کرنا تھا۔ رسول کے مکذبین کے لیے قیامت کی یہ گھڑی اُس عذاب سے شروع ہو جاتی ہے، جو اُس کی تکذیب پر اصرار کے نتیجے میں

دنیا ہی میں برپا ہو جاتا ہے اور اِس گھڑی کا اتمام اُس وقت ہو گا، جب صور پھونکا جائے گا اور قیامت واقع ہو جائے گی۔

11۔ شق قمر کا واقعہ اصلاً قرآنِ مجید میں مذکور ہے۔ اُس نے اِس قسم کی نشانیوں کے پس منظر اور خاص اِس واقعے کی نوعیت اور غرض و غایت کو پوری صراحت سے واضح کیا ہے۔ چنانچہ اِس واقعے کی تشریح و تفصیل میں اُسی کے مندرجات کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔

12۔ تاہم، اِس کا ذکر متعدد صحابۂ کرام نے بھی کیا ہے۔ اِن میں حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت جبیر بن مطعم، حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت عبد اللہ بن عمر، حضرت حذیفہ بن یمان اور حضرت انس بن مالک رضوان اللہ علیہم اجمعین نمایاں ہیں۔ اِن میں سے بعض عینی شاہدین ہیں اور بعض نے اِسے دوسروں کی شہادت پر روایت کیا ہے۔

13۔ روایتوں کا مجموعی مفہوم یہ ہے کہ یہ واقعہ زمانۂ رسالت میں ہجرت سے کم و بیش 5 سال پہلے رونما ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب منیٰ میں موجود تھے۔ چاند بدرِ کامل کی صورت میں تھا اور واضح نظر آ رہا تھا۔ یک بہ یک وہ پھٹا اور دو ٹکڑے ہو کر الگ ہو گیا۔ ایک ٹکڑا پہاڑ کے ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف چلا گیا۔ یہ حیرت انگیز منظر لحظہ بھر کے لیے قائم رہا اور پھر دونوں ٹکڑے آپس میں مل گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم اِس واقعے کے گواہ رہنا۔ کفار نے یہ منظر براہِ راست دیکھا، مگر اُنھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ اِس لیے اُنھوں نے اِسے جادو کہہ کر جھٹلانے کی کوشش کی۔ اُن میں سے بعض نے تجویز دی کہ حتمی رائے قائم کرنے سے پہلے سفر پر گئے ہوئے لوگوں کو واپس آ لینے دیں۔ اُن کا مشاہدہ فیصلہ کن ہو گا، کیونکہ ہماری آنکھیں تو مسحور ہو سکتی ہیں، مگر غیر موجود ہونے کی وجہ سے وہ سحر زدہ نہیں ہو سکتے۔ یہ تجویز قبول ہوئی۔ جب لوگ آئے تو معلوم ہوا کہ اُنھوں نے بھی بعینہٖ چاند کے پھٹنے کا مشاہدہ کیا تھا۔ چنانچہ کفار کے لیے واقعے کا انکار ممکن نہیں رہا۔ تاہم، اِس کے باوجود وہ ایمان نہیں لائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انذار کی تردید و تکذیب پر کمربستہ رہے۔

14۔ اِس مجموعی مفہوم کی صحت پر علما و محدثین متفق ہیں۔

15۔ اِس متفق علیہ مفہوم پر حضرت انس رضی اللہ عنہ سے منسوب بعض طرق میں یہ اضافہ

شامل ہے کہ یہ واقعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حین حیات دو مرتبہ واقع ہوا تھا اور قریش کے مطالبۂ نشانی کے جواب میں رونما ہوا تھا۔ محدثین و مفسرین میں سے بعض نے اِس اضافے کو قبول کیا ہے اور بعض نے راویوں کا تسامح سمجھ کر رد کیا ہے۔ قرآنِ مجید کے نظائر، سورۂ قمر کی آیات اور انشقاقِ قمر کے موضوع کی تمام روایتوں کو جمع کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ اضافہ صحیح نہیں ہے۔

16۔ شق قمر کی معجزانہ نوعیت کے بارے میں بھی علما میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ حدیث و تفسیر کے اکثر علما اسے معجزاتِ نبوت میں شامل کرتے اور اِس کے صدور کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کرتے ہیں۔ بعض دیگر علما اِسے اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیتے ہیں، مگر معجزے کی معروف اصطلاح کا اطلاق اِس پر نہیں کرتے۔ اُن کے نزدیک اِسے معجزاتِ نبوت میں شمار کرنا علمی اور اصطلاحی لحاظ سے درست نہیں ہے۔ عصرِ حاضر کے دو جلیل القدر علما مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا امین احسن اصلاحی اِسی دوسرے موقف پر قائم ہیں۔

17۔ جناب جاوید احمد غامدی شق القمر کی بحث کے تمام اجزا میں مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کی مجموعی رائے سے اتفاق کرتے اور اِسی کو اپنے موقف کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

18۔ شق قمر کے بارے میں غامدی صاحب کے موقف کو اِن نکات میں بیان کیا جا سکتا ہے:

i۔ غامدی صاحب شق قمر کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں۔

ii۔ وہ اِسے ایک حسی واقعہ مانتے اور پروردگارِ عالم کی قدرتِ کاملہ کا مظہر قرار دیتے ہیں۔

iii۔ اُن کے نزدیک شق قمر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آپ کے انذار کی تائید میں اور آپ کے مکذبین کے لیے عذاب کی نشانی کے طور پر واقع ہوا تھا۔

iv۔ وہ اپنے موقف کی بنا قرآنِ مجید پر قائم کرتے ہیں، مگر اُس کی تائید و تفہیم میں صحابہ کی روایات کو پوری طرح قبول کرتے ہیں۔

v۔ جہاں تک اِس کے لیے معجزے کی اصطلاح کے استعمال کا تعلق ہے تو وہ اُسے صحیح نہیں سمجھتے۔ اِس معاملے میں وہ مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے موقف کو قرآن و حدیث کے مطابق سمجھتے ہیں اور علما کے روایتی موقف کو قرآن و حدیث کے منشا کے موافق خیال نہیں کرتے۔

vi۔ اُن کے نزدیک اِس معاملے میں کلیدی حیثیت لفظِ 'آیۃ' کے مفہوم و مصداق کو حاصل

ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ واقعے کے لیے قرآن نے یہی لفظ اختیار کیا ہے۔

vii۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر اِس لفظ کا مصداق قرآنِ مجید کے نظائر کی روشنی میں طے کیا جائے تو اِس کا شمار اُن نشانیوں میں ہو گا، جو اللہ کے براہِ راست حکم سے ظاہر ہوئیں اور جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط کو اختیار نہیں کیا گیا۔

viii۔ تاہم، وہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اُن تمام معجزات و خوارق کو برحق مانتے ہیں، جو قرآنِ مجید میں بیان ہوئے ہیں یا حدیث و سیرت کی مستند روایات میں منقول ہیں۔

[باقی]

تفہیم الآثار

ڈاکٹر عمار خان ناصر

اہل بیت کرام کی تعظیم و توقیر

(5)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رشتہ و قرابت کے تعلق سے، اہل ایمان سے آپ کے اہل بیت اور خصوصاً ازواج مطہرات کی تعظیم و تکریم کا رویہ مطلوب ہے، جس کا ذکر قرآن مجید اور احادیث میں مختلف پہلوؤں سے کیا گیا ہے۔ سورۂ احزاب میں فرمایا ہے کہ:

النَّبِيُّ أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ وَأَزْوَاجُهُ أُمَّهَاتُهُمْ. (الاحزاب 6:33)

”پیغمبر کا حق اہل ایمان پر ان کی اپنی جانوں سے بھی بڑھ کر ہے اور پیغمبر کی ازواج ان کی ماؤں کا درجہ رکھتی ہیں۔“

سورہ کی آیت 53 میں اسی نسبت سے مسلمانوں پر لازم ٹھہرایا گیا ہے کہ ان کے مرد، آپ کی ازواج سے روبرو ہو کر بات نہ کیا کریں، بلکہ جو بھی گفتگو مقصود ہو، پردے کے پیچھے سے کیا کریں۔ مزید یہ کہ آپ کے بعد آپ کی ازواج سے نکاح کرنا بھی کسی کے لیے جائز نہیں ہے۔ اسی سورہ کی آیت 33 میں آپ کے اہل بیت کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ پیغمبر کے ساتھ تعلق اور نسبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ پیغمبر کے اہل بیت کے دامن کو کسی بھی اخلاقی الزام

سے آلودہ نہ ہونے دے اور ان کی شخصیت اور کردار کو پاکیزہ رکھے:

إِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ أَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيرًا.

”نبی کے گھر والو، اللہ یہی چاہتا ہے کہ تم سے اس گندگی کو دور کرے (جو منافق تم پر تھوپنا چاہتے ہیں) اور تمھیں پوری طرح پاکیزہ بنا دے۔“

آیت کے سیاق وسباق کے لحاظ سے یہاں 'اہل البیت' کہہ کر آپ کی ازواج کو خطاب کیا گیا ہے، جب کہ اس کے وسیع تر مفہوم میں آپ کے دیگر اہل قرابت بھی شامل ہیں، جیسا کہ روایات میں اس تعبیر کے استعمالات سے واضح ہوتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے متعدد ارشادات میں اپنے اہل بیت کی تعظیم وتوقیر سے متعلق مطلوب رویے کی تعلیم وتلقین فرمائی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق پیغمبر پر درود بھیجنے کے لیے صحابہ کو کلمات سکھائے تو اس میں اپنی آل کو بھی شامل فرمایا۔ درود ابراہیمی میں اس کے الفاظ یہ ہیں:

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلَى إِبْرَاهِيمَ وَآلِ إِبْرَاهِيمَ، إِنَّكَ حَمِيدٌ مَجِيدٌ. (نسائی، رقم 1279)

”اے اللہ، محمد پر اور محمد کی آل پر رحمت نازل فرما، جیسے تو نے ابراہیم پر اور ابراہیم کی آل پر رحمت فرمائی۔ بے شک، تو حمد کا سزاوار، بزرگ ہے۔“

دیگر روایات میں 'آل' کی جگہ 'ازواج' اور 'ذریت' کا ذکر ہے، جس سے 'آل' کا مفہوم بھی واضح ہوتا ہے:

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَأَزْوَاجِهِ وَذُرِّيَّتِهِ كَمَا صَلَّيْتَ عَلَى آلِ إِبْرَاهِيمَ. (نسائی، رقم 1285)

”اے اللہ، محمد پر اور محمد کی بیویوں اور اولاد پر رحمت فرما، جیسے تو نے ابراہیم کی آل پر رحمت فرمائی۔“

اسی طرح بنو ہاشم کے مخصوص خاندانوں کے لیے لوگوں سے زکوٰۃ اور صدقہ لینے کو ممنوع ٹھہرایا اور فرمایا:

إِنَّ هَذِهِ الصَّدَقَاتِ إِنَّمَا هِيَ أَوْسَاخُ

”یہ صدقات تو لوگوں (کے مال) کا

النَّاسِ، وَإِنَّهَا لَا تَحِلُّ لِمُحَمَّدٍ وَلَا لِآلِ مُحَمَّدٍ. (مسلم، رقم 1849)

میل کچیل ہوتے ہیں، یہ نہ محمد کے لیے حلال ہیں اور نہ محمد کی آل کے لیے۔"

کئی مواقع پر لوگوں کو تنبیہ فرمائی کہ وہ آپ کے اہل بیت کے ساتھ اچھا برتاؤ کریں اور ان کی نسبت اور تعلق کے احترام کو ملحوظ رکھیں۔ مثلاً اپنے چچا سیدنا عباس رضی اللہ عنہ سے متعلق بعض لوگوں کے رویے میں بے رخی دیکھی تو انھیں متنبہ فرمایا:

مَا بَالُ رِجَالٍ يُؤْذُونَنِي فِي الْعَبَّاسِ؟ فَإِنَّ عَمَّ الرَّجُلِ صِنْوُ أَبِيهِ. (المعجم الکبیر، رقم 17463)

"کچھ لوگ مجھے عباس رضی اللہ عنہ کے بارے میں اذیت کیوں دیتے ہیں؟ آدمی کا چچا تو اس کے باپ ہی کا درجہ رکھتا ہے۔"

ایک موقع پر بریدہ رضی اللہ عنہ نے سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی کوئی شکایت آپ کے سامنے پیش کی تو فرمایا:

يَا بُرَيْدَةُ، أَلَسْتُ أَوْلَى بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنْفُسِهِمْ؟ قُلْتُ: بَلَى يَا رَسُولَ اللّٰهِ، قَالَ: مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ. (مسند احمد، رقم 22367)

"اے بریدہ، کیا میں مومنوں پر ان کی جانوں سے زیادہ حق نہیں رکھتا؟ میں نے کہا: یارسول اللہ، بالکل رکھتے ہیں۔ فرمایا کہ جس کا میں آقا ہوں، اس کا علی بھی آقا ہے۔"

سیدہ فاطمہ نے کسی موقع پر سیدہ عائشہ کے ساتھ کچھ سخت کلامی کی تو آپ نے انھیں نصیحت فرمائی:

يَا فَاطِمَةُ، أَلَيْسَ تُحِبِّينَ مَنْ أُحِبُّ؟ قَالَتْ: نَعَمْ. وَتُبْغِضِينَ مَنْ أُبْغِضُ؟ قَالَتْ: بَلَى. قَالَ: فَإِنِّي أُحِبُّ عَائِشَةَ فَأَحِبِّيهَا. (مسند ابی یعلیٰ، رقم 4827)

"اے فاطمہ، کیا جس سے مجھے محبت ہے، اس سے تمھیں محبت نہیں؟ فاطمہ نے کہا: بالکل ہے۔ فرمایا کہ جس سے مجھے نفرت ہے، اس سے تمھیں نفرت نہیں؟ فاطمہ نے کہا: بالکل ہے۔ فرمایا کہ مجھے عائشہ سے محبت ہے، اس لیے تم بھی

اس سے محبت رکھو۔“

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے ابو جہل کی بیٹی سے نکاح کا ارادہ کیا تو سیدہ فاطمہ کی شکایت پر آپ نے اس پر سخت رنج کا اظہار کیا اور فرمایا:

إِنَّمَا فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّي يُؤْذِينِي مَا آذَاهَا.(مسلم، رقم4588)

”فاطمہ میرا ہی ایک ٹکڑا ہے، جس بات سے اس کو اذیت ہوتی ہے، اس سے مجھے بھی اذیت پہنچتی ہے۔“

خصوصاً حجۃ الوداع سے واپسی پر غدیر خم کے مقام پر اپنے خطبے میں اپنے اہل بیت کے متعلق تلقین کرتے ہوئے صحابہ سے فرمایا:

أُذَكِّرُكُمُ اللهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي، أُذَكِّرُكُمُ اللهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي، أُذَكِّرُكُمُ اللهَ فِي أَهْلِ بَيْتِي.(مسلم، رقم4530)

”میں اپنے اہل بیت کے متعلق تمھیں اللہ کے حکم کی پاس داری کی تلقین کرتا ہوں، میں اپنے اہل بیت کے متعلق تمھیں اللہ کے حکم کی پاس داری کی تلقین کرتا ہوں، میں اپنے اہل بیت کے متعلق تمھیں اللہ کے حکم کی پاس داری کی تلقین کرتا ہوں (آپ نے تین مرتبہ یہ جملہ دہرایا)۔“

زیر نظر فصل میں اسی موضوع سے متعلق صحابہ و تابعین کے آثار کا مطالعہ کیا جائے گا۔

ازواج نبی صلی اللہ علیہ وسلم

(1)

عَنْ أُمِّ بَكْرٍ بِنْتِ الْمِسْوَرِ، أَنَّ عَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنَ عَوْفٍ بَاعَ أَرْضًا لَهُ مِنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ بِأَرْبَعِينَ أَلْفَ دِينَارٍ، فَقَسَمَهُ فِي فُقَرَاءِ بَنِي زُهْرَةَ، وَفِي الْمُهَاجِرِينَ وَأُمَّهَاتِ الْمُؤْمِنِينَ، قَالَ الْمِسْوَرُ: فَأَتَيْتُ عَائِشَةَ بِنَصِيبِهَا فَقَالَتْ: مَنْ أَرْسَلَ بِهَذَا؟

فَقُلْتُ: عَبْدُ الرَّحْمَنِ، قَالَتْ: أَمَا إِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: ''لَا يَحْنُو عَلَيْكُنَّ بَعْدِي إِلَّا الصَّابِرُونَ''، سَقَى اللّٰهُ عَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنَ عَوْفٍ مِنْ سَلْسَبِيلِ الْجَنَّةِ. (مسند احمد، رقم 24205)

''مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی ام بکر بیان کرتی ہیں کہ عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اپنی ایک زمین عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو چالیس ہزار دینار میں فروخت کی اور یہ رقم بنو زہرہ کے محتاجوں، مہاجرین اور امہات المومنین میں تقسیم کر دی۔ مسور کہتے ہیں کہ میں سیدہ عائشہ کے پاس ان کے حصے کی رقم لے کر گیا تو انھوں نے پوچھا کہ یہ کس نے بھیجی ہے؟ میں نے بتایا کہ عبد الرحمٰن بن عوف نے۔ ام المومنین نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو (اپنی ازواج سے) یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میرے بعد تمھارے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کرنے والے یقیناً صبر واستقامت کی صفت سے متصف ہوں گے۔ (پھر سیدہ عائشہ نے کہا کہ) اللہ تعالیٰ عبد الرحمٰن بن عوف کو جنت کی نہر سے سیراب کرے۔''

لغوی تشریح

يَحْنُو عَلَيْكُنَّ: 'حنا علیہ' کا مطلب ہے: کسی کے ساتھ ہم دردی اور مہربانی سے پیش آنا۔

شرح ووضاحت

قرآن مجید میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کو امت کی ماؤں کا درجہ دیتے ہوئے آپ کی وفات کے بعد کسی کے لیے ازواج سے نکاح کرنے کو ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ازواج پر حجاب کی خصوصی پابندی بھی عائد کی گئی تھی، جس کی رو سے ان کے لیے اپنے گھروں تک محدود رہنا لازم تھا اور کسی ناگزیر ضرورت کے بغیر انھیں گھروں سے باہر نکلنے اور لوگوں کے ساتھ اختلاط کرنے کی آزادی حاصل نہیں تھی۔ اس تناظر میں ان کی ضروریات کی کفالت اور دیکھ بھال مجموعی طور پر مسلمانوں ہی کے ذمے تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی پہلو سے ازواج کے متعلق فکر مندی رہتی تھی کہ آپ کے بعد کہیں لوگ ان سے متعلق اپنی ذمہ داری کو ادا کرنے

میں تنگی محسوس نہ کریں اور کوتاہی سے کام نہ لیں۔ اسی حوالے سے آپ نے مذکورہ ارشاد میں ان لوگوں کے لیے تحسین کے کلمات ارشاد فرمائے ہیں جو آپ کے بعد آپ کی ازواج کے حقوق اور مقام کی پاس داری میں ثابت قدم رہیں اور ذمہ داری کے ساتھ ان کی ضروریات کی دیکھ بھال کرتے رہیں۔

تخریج اور اختلاف طرق

یہ اثرام بکر بنت مسور کی سند سے سیدہ عائشہ سے درج ذیل مصادر میں بھی منقول ہے:

المستدرک علی الصحیحین، رقم 5361۔ الزہد لاحمد بن حنبل، رقم 1106۔ الطبقات الکبیر لابن سعد، رقم 2933۔ الشریعۃ للآجری، رقم 1740۔ مشکل الآثار للطحاوی، رقم 3045۔

مسور بن مخرمہ کے علاوہ سیدہ عائشہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد، عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے فرزند ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن نے بھی روایت کیا ہے۔ اس کے الفاظ یوں ہیں:

قَالَ: قَالَتْ عَائِشَةُ: إِنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ أَحْنَى عَلَيَّ، فَقَالَ: ''إِنَّكُنَّ لَاَهَمُّ مَا أَتْرُكُ إِلَى وَرَاءِ ظَهْرِي، وَاللّٰهِ لَا يَعْطِفُ عَلَيْكُنَّ إِلَّا الصَّابِرُونَ أَوْ الصَّادِقُونَ''.

(مسند احمد، رقم 24371)

''نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر میرے متعلق ہم دردی اور شفقت کی کیفیت میں فرمایا کہ میں اپنے پیچھے جو معاملات چھوڑ کر جا رہا ہوں، ان میں سے مجھے سب سے زیادہ فکر مندی تمھارے، (یعنی اپنی ازواج کے) متعلق لاحق ہے۔ بخدا، تمھارے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کرنے والے صابر یا (یوں فرمایا کہ) صادق ہی ہوں گے۔''

ترمذی کے طریق میں وضاحت ہے کہ روایت کے آخر میں عبد الرحمٰن بن عوف کے لیے دعائیہ جملہ سیدہ عائشہ کا ہے:

قَالَ: ثُمَّ تَقُولُ عَائِشَةُ: فَسَقَى اللّٰهُ أَبَاكَ مِنْ سَلْسَبِيلِ الجَنَّةِ، تُرِيدُ

''پھر سیدہ عائشہ نے (ابو سلمہ سے) کہا کہ اللہ تمھارے والد، یعنی عبد الرحمٰن بن

عَبْدَ الرَّحْمَنِ بْنَ عَوْفٍ. عوف کو جنت کی نہر سے سیراب کرے۔"

(ترمذی، رقم 3749)

امہات المومنین کے ساتھ صلۂ رحمی کرنے والوں کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے بھی درج ذیل مآخذ میں نقل ہوا ہے:

مسند احمد، رقم 26013۔ المعجم الکبیر للطبرانی، رقم 19507۔ المستدرک علی الصحیحین، رقم 5362۔ الطبقات الکبیر لابن سعد، رقم 2932۔ معرفۃ الصحابۃ لابی نعیم، رقم 475۔

(2)

عَنْ كَرِيمَةَ وَهِيَ ابْنَةُ مقداد . . . أَن الْمِقْدَاد أوصى لِلْحسنِ وَالْحُسَيْن ابنى على بن أبي طَالب لكل وَاحِد منهما بِثَمَانِيَة عشر ألف دِرْهَم وَأوصى لِنسَاء النَّبِي صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ سَبْعَة آلاف دِرْهَم لكل امْرَأَة مِنْهُنَّ فقبلوا وَصيته.

(التاریخ الاوسط للبخاری، رقم 328)

"کریمہ بنت مقداد کی روایت ہے کہ مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ نے علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے فرزندوں حسن اور حسین میں سے ہر ایک کے لیے اٹھارہ ہزار درہم کی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج میں سے ہر زوجہ کے لیے سات ہزار درہم کی وصیت کی اور انھوں نے ان کی وصیت قبول کر لی۔"

شرح و وضاحت

1۔ مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ بدری صحابی تھے۔ روایات میں بیان ہوا ہے کہ انھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ان لوگوں کے متعلق اچھی توقع کا اظہار سنا تھا جو آپ کے بعد آپ کی ازواج کی خبر گیری کریں گے۔ چنانچہ ان کی اہلیہ ضباعہ بنت زبیر روایت کرتی ہیں:

عَنِ الْمِقْدَادِ بْنِ الْأَسْوَدِ، قَالَ: قُلْتُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وسَلَّمَ: شَيْئًا سَمِعْتُهُ مِنْكَ شَكَكْتُ فِيهِ،

"مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں نے آپ سے ایک بات

قَالَ: ''فَإِذَا شَكَّ أَحَدُكُمْ فِي الْأَمْرِ فَلْيَسْأَلْنِي عَنْهُ''، قَالَ: قَوْلُكَ فِي أَزْوَاجِكَ: ''إِنِّي لَأَرْجُو لَهُنَّ مِنْ بَعْدِي الصِّدِّيقِينَ''، قَالَ: ''وَمَنْ تَعُدُّونَ الصِّدِّيقِينَ''؟ قَالَ: فَقُلْنَا: أَوْلَادَنَا الَّذِينَ يَهْلِكُونَ صِغَارًا، فَقَالَ: ''لَا، وَلَكِنَّ الصِّدِّيقِينَ هُمُ الْمُتَصَدِّقُونَ''.
(مسند ابن ابی شیبہ، رقم 489)

سنی ہے، لیکن اس کے مفہوم کے متعلق مجھے کچھ تردد ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تم میں سے کسی کو کسی بات میں تردد ہو تو وہ مجھ سے پوچھ لیا کرے۔ میں نے کہا کہ آپ نے اپنی ازواج کے متعلق فرمایا کہ مجھے اپنے بعد ان کے لیے ایسے افراد کی توقع ہے جو صدیقین ہوں گے۔ آپ نے پوچھا کہ تم لوگ صدیق کسے شمار کرتے ہو؟ ہم نے کہا کہ ہم تو اس کا مصداق اپنے ان بچوں کو سمجھتے ہیں جو نابالغی کی حالت میں وفات پا گئے۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں، بلکہ صدیقین سے مراد صدقہ کرنے والے ہیں۔"

مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ نے اسی جذبے سے اپنے مال میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج اور آپ کے نواسوں کے لیے وصیت کی تھی، جس کا زیر بحث اثر میں ذکر کیا گیا ہے۔

2۔ 'صِدِّیق'، 'صدق' سے مبالغے کا صیغہ ہے، جس کا مفہوم سچائی اور راستی میں درجۂ کمال پر فائز ہونا ہے۔ اسی مفہوم میں اس صفت کا ذکر قرآن مجید میں انبیا کے لیے بھی ہوا ہے[1] اور انبیا کی تصدیق اور نصرت میں پیش پیش رہنے والوں کے لیے بھی۔[2] طبری رحمہ اللہ نے اس کے جامع مفہوم کو یوں واضح کیا ہے:

الصِّدِّيقُونَ: تُبَّاعُ الْأَنْبِيَاءِ الَّذِينَ صَدَقُوهُمْ وَاتَّبَعُوا مِنْهَاجَهُمْ

" صدیقین، انبیا کے وہ پیروکار ہیں جنھوں نے ان کے ساتھ کیے ہوئے عہد

---

[1]۔ مریم 19:41، 56۔

[2]۔ النساء 4:69۔ الحدید 57:19۔

بَعْدَهُمْ حَتّٰی لَحِقُوا بِهِمْ. (تفسیر طبری 7/211)

کو پورا کیا اور ان کے بعد بھی ان کے طریقے پر قائم رہے، یہاں تک کہ انھی سے جا ملے۔“

زیر نظر روایت میں مقداد بن اسود نے اس کی تفسیر نابالغی میں وفات پا جانے والے بچوں سے غالباً اس پہلو سے کی ہے کہ جو بچے فطرت پر پیدا ہوئے اور بلوغت سے پہلے ہی کفر و ایمان کی آزمایش سے دوچار ہوئے بغیر دنیا سے چلے گئے، ان کے متعلق ظاہراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایمان و تصدیق کی حالت میں فوت ہوئے ہیں۔ بہرحال نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بتایا کہ ’صدیقین‘ سے یہاں آپ کی مراد صدقہ وانفاق کرنے والے ہیں۔ یہ لفظ کی تشریح اس کے لازم کے لحاظ سے کرنے کی مثال ہے۔ مراد یہ کہ میرے بعد جو لوگ اپنے ایمان اور عہد پر قائم اور اپنی ایمانی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں ثابت قدم رہیں گے، وہ میری ازواج کی ضروریات کی کفالت کے لیے اپنا مال بھی ان پر خرچ کریں گے۔ گویا اس معاملے میں صدقہ وانفاق کا عمل، ان کی صدیقیت کا ایک تقاضا ہو گا۔

تخریج اور اختلاف طرق

یہ اثر کریمہ بنت مقداد کی سند سے تاریخ دمشق لابن عساکر 60/181 اور التاریخ الصغیر للبخاری 1/83 میں بھی مروی ہے۔

[باقی]

ڈاکٹر عرفان شہزاد

فکر غامدی: چند اعتراضات کا جائزہ

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحابِ فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

قرآن: رسول کی سرگذشتِ انذار

غامدی صاحب نے قرآن مجید کو مضمون کے لحاظ سے ''ایک رسول کی سرگذشتِ انذار'' قرار دیا ہے۔ اس پر اعتراض کیا گیا ہے کہ پورے قرآن کو تاریخی کتاب قرار دینے سے اس کی آفاقیت مجروح ہوتی ہے۔ وہ تاریخ میں بند ایک داستان (اساطیر الاولین) بن جاتا ہے اور عام قاری خود کو اس سے متعلق نہیں کر پاتا، کیونکہ یہ کہیں اس سے مخاطب نہیں ہوتا۔

یہ اعتراض قرآن کے موضوع اور قرآن کے مضمون کے فرق کو نظر انداز کرنے سے پیدا ہوا ہے۔ قرآن اپنے موضوع کے لحاظ سے خدا کی آفاقی ہدایت اور انذارِ آخرت ہے، لیکن اس کی پیشکش رسول کی سرگذشت انذار کی صورت میں ہوئی ہے۔ یہ اس کا مضمون ہے۔ قرآن کی یہ نوعیت ایک حقیقتِ واقعہ ہے۔ مفسرین کے ہاں شانِ نزول کی روایات کا التزام قرآن کی تاریخی حیثیت ہی کا اظہار کرتا ہے۔

لفظ ''سرگذشت'' کے بجاے ''رسول کی سرگذشتِ انذار'' کی پوری ترکیب پر غور کیا جائے تو

بات واضح ہو جاتی ہے۔ قرآن محض ایک سرگذشت نہیں، یہ محض رسول کی سرگذشت بھی نہیں، بلکہ وہ سیرت کا موضوع ہے، یہ ”رسول کے انذار کی سرگذشت“ ہے، جہاں انسانوں کے مختلف گروہ رسول کی دعوتِ دین کے مخاطب ہیں اور اسی کے ذیل میں دین و شریعت بیان ہوئے ہیں۔

ایک رسول کی سرگذشتِ انذار ہونے کی بنا پر یہ محض ایک سوانح یا کسی تاریخ کا بیان نہیں رہ جاتا۔ رسول، خدا کا دین لے کر آتا ہے، جو اپنی نوعیت ہی میں آفاقی ہے۔ قرآن اُسی دین کی تبلیغ میں رسول کی سرگرمیوں اور اس کو درپیش حالات کا بیان ہے۔ اس سرگذشت میں دیکھا جا سکتا ہے کہ رسول نے تبلیغ دین کا فریضہ کس اہتمام سے سرانجام دیا، اس کی قوم نے اس کے رد و قبول میں کن رویوں کا اظہار کیا۔ اسے قبول کرنے والوں پر کیا بیتی، اپنے تزکیہ و تطہیر کے لیے وہ کن مراحل سے گزر کر خدا کی رضا کے مستحق ٹھیرے، رسول کے منکرین پر اتمام حجت کیسے ہوا اور کیسے وہ سزا کے مستحق ہو کر سزایاب ہوئے۔ وہ دیکھ سکتے ہیں کہ دین کس طرح ایک تدریجی حکمت کے ساتھ تعلیم کیا گیا، اہل ایمان نے اطاعت و مصائب پر صبر سے کام لیا، وہ اپنی درماندگی کا اعتراف کرتے، خدا سے نصرت کی خواست گاری کرتے، فتوحات پر شکر کرتے، لغزش و کوتاہی پر تنبیہات پاتے، نادم ہوتے، اپنی اصلاح کرتے اور خدا سے انعام پاتے نظر آتے ہیں، اور دوسری طرف دوسرے لوگ کھلے حقائق کا انکار کرتے، سرکشی پر اڑتے، مفادات کے اسیر ہوتے، تعصب اور دشمنی میں اندھے بہرے بن جاتے، منافقت اختیار کرتے، بے نقاب ہوتے اور سزا پاتے دکھائی دیتے ہیں۔ گویا، خدا کی عدالت لگی ہے، جہاں لوگوں کے اعمال تولنے کے بعد ان کی جزا اور سزا کے فیصلے ہو رہے ہیں۔ یوں یہ کتاب اخلاق و شریعت کی معلّم ہی نہیں، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ایک زندہ کتاب بن کر سامنے آتی ہے، جس کے ذریعے سے دین کی مجرد تعلیم ہی منتقل نہیں ہوتی، اس کے ساتھ انسانی تعاملات اور رویے بھی منتقل ہوتے ہیں۔ قرآن سے ایک عام قاری کو صرف دین ہی نہیں ملتا، بلکہ اس پر عمل کے انسانی نمونے بھی ملتے ہیں، جو اس کی نفسیات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کر لیتے ہیں۔ اس طرح قرآن ہر فرد کے ساتھ پورے طور پر متعلق ہو جاتا ہے، اور یہ دین سکھانے کی بہترین صورت ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سرگذشت انذار کے اُس دور میں خدا کی محسوس مداخلت کس طرح اپنے دعاوی اور چیلنجز کی تکمیل کے ساتھ سامنے آئی، جس نے خدا کے وجود، اس کی

وحدانیت اور وقوعِ آخرت پر ناقابلِ تردید شہادتیں قائم کر دیں۔ پھر یہ سب حالات بعد والوں کے لیے ایک کتاب کی صورت میں محفوظ کر دیے گئے تاکہ قیامت تک اس کے پڑھنے والوں پر خدا کی حجت تمام ہوتی رہے کہ اس کائنات کا ایک خدا ہے، جس نے انسانوں سے کچھ تقاضے کیے ہیں، اور وہ ان سے جواب طلب کرنے کے لیے ایسے ہی آخرت کی عدالت لگائے گا، جیسے اس نے اس دنیا میں ایک قوم کے لیے لگائی تھی۔

غامدی صاحب نے اپنی تفسیر ''البیان'' کے مقدمے میں جہاں یہ لکھا ہے کہ ''اپنے مضمون کے لحاظ سے قرآن ایک رسول کی سرگذشت انذار ہے''، وہاں یہ بھی لکھا ہے:

> ''نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے نتیجے میں خدا کی جو عدالت سرزمین عرب میں قائم ہوئی، اُس کی روداد اِس حسن ترتیب کے ساتھ اِس کتاب میں ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دی گئی ہے۔ اِس لحاظ سے دیکھیے تو قرآن مذہب کا یہ بنیادی مقدمہ بالکل آخری درجے میں ثابت کر دیتا ہے کہ خدا کی عدالت پورے عالم کے لیے بھی ایک دن اِسی طرح قائم ہو کر رہے گی۔''(1/12)

یہ وہ اصل ہے جس پر دین کا مقدمہ قائم ہے، وہ محرک ہے، جو فرد کے لیے دین پر عمل کا تقاضا پیدا کرتا ہے۔ آخرت کی جواب دہی کا یقین پیدا ہوتے ہی فرد کو اپنے تزکیے کی فکر لاحق ہوتی ہے تو قرآن اسے بتاتا ہے کہ یہ تزکیہ اسے اسی طرح حاصل ہو گا، جس طرح پہلوں نے اس دین پر عمل کر کے حاصل کیا۔

کسی عام سرگذشت کے برعکس ''رسول کی سرگذشتِ انذار'' کے عنوان سے یہ طے نہیں ہو جاتا یا یہ خدشہ پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ اس میں دی گئی ہدایات اور احکام اصلاً خاص ہیں اور اب ان کی تعمیم کے لیے کوئی دلیل دیکھی جائے۔ رسول تمام انسانوں کے لیے خدا کا پیغام لے کر آتا ہے، اس لیے اس کی سرگذشت میں ہر بات یہ احتمال رکھتی ہے کہ وہ سب کے لیے ہو، اسی لیے یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ کیا چیز انذارِ رسالت کے مخاطبین کے ساتھ خاص ہے، جو اب دیگر لوگوں کے لیے باقی نہیں رہی۔ وہ چند احکام جو قانونِ رسالت یا قانونِ اتمامِ حجت کے نتیجے میں خاص قرار پاتے ہیں انھیں غامدی صاحب نے متعین کر کے پیش کر دیا ہے۔ کسی خلط مبحث کی گنجایش نہیں ہے۔ اس کے بعد اس کہانت کی کوئی حقیقت نہیں رہتی کہ دین کو تاریخ کے کسی دور میں متحجر (Fossilized) کرنے کی کوئی منصوبہ بندی کی جا رہی ہے۔

ان خاص احکام کی ایک فہرست یہاں دی جاتی ہے:

1۔ انکارِ اسلام کی پاداش میں رسول کی مخاطب قوم سے قتال، درحقیقت، خدا کی طرف سے ان کی سزا کا حکم تھا، جو رسول کے اتمام حجت کے بعد صادر کیا گیا تھا۔ عام مسلمانوں کو اس کا حق نہیں کہ تبلیغِ دین کے بعد کسی قوم کے انکار پر ان کے خلاف مسلح اقدام کریں۔ البتہ، ظلم وعدوان کے خلاف جہاد ایک عمومی فریضہ ہے، کیونکہ اس کے روبۂ عمل ہونے کی علت، یعنی ظلم وعدوان، ایک عام علت ہے۔

2۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتمام حجت کے بعد کفار سے تعلقات اور معاہدات کا خاتمہ کر دیا گیا تھا۔ مسلمانوں کے لیے کفار اور اہل کتاب سے دوستی کی ممانعت اس بائیکاٹ کا نتیجہ تھا۔ عام غیر مسلموں سے دوستی نہ کرنے کا کوئی عمومی حکم نہیں دیا گیا ہے۔

3۔ مسلم اور غیر مسلم کی گواہی میں فرق بھی دورِ رسالت کا اختصاص تھا، اس کی وجہ بھی اتمامِ حجت کے بعد منکرینِ حق کے ساتھ یہی بائیکاٹ تھا، لیکن اب یہ فرق ملحوظ رکھنے کی کوئی وجہ نہیں رہی۔

4۔ عہدِ رسالت میں مسلم اور غیر مسلم میاں بیوی میں تفریق بھی اسی بائیکاٹ کا نتیجہ تھی۔ اس کو بھی عمومی حکم نہیں سمجھا جا سکتا۔

5۔ آپ کے دور میں مسلم اور غیر مسلم ایک دوسرے کے وارث نہیں بن سکتے تھے، اس تفریق کا سبب بھی یہی بائیکاٹ تھا۔ اسے بھی عمومی حکم قرار نہیں دیا جا سکتا۔

6۔ ارتداد الگ سے کوئی جرم نہیں، لیکن یہ درحقیقت کفر ہی تھا اور کفر کی سزا مشرکین کے لیے سورۂ توبہ میں مذکور حکم کے مطابق موت مقرر کی گئی تھی۔ وہی سزا مرتدین پر لاگو کی گئی تھی، اسے عام حکم نہیں سمجھا جا سکتا۔

یہ واضح رہنا چاہیے کہ ازواجِ مطہرات کے حجاب کی تخصیص کے معاملے میں غامدی صاحب صحابہ اور متقدمین علما کے فہم کے ساتھ کھڑے ہیں۔ ازواجِ مطہرات کے حجاب کی تعمیم کا موقف بعد کے ادوار میں سامنے آیا، جب کہ آیتِ جلباب کی تفہیم میں قانونِ رسالت یا قانونِ اتمامِ حجت کا کوئی عمل دخل نہیں ہے، جیسا کہ ایک فاضل ناقد نے سمجھا ہے۔ یہاں لسانی دلالت کی بحث ہے۔ بتایا گیا کہ چادر اوڑھنے کے حکم کی علت اوباشوں کا دفعِ ضرر تھا، جسے خود اللہ تعالیٰ نے

بیان کر دیا ہے۔[1] اس علت کی بنا پر اس حکم کو اُسی صورت حال یا ایسی ہی کسی صورت حال سے متعلق سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ عام حالات کے لیے کوئی ہدایت نہیں ہے۔

غامدی صاحب کے ڈسکورس میں دین کے عام اور خاص احکام میں انتخاب الل ٹپ معاملہ نہیں۔ الفاظ کی دلالت اور احکام کی علتوں کی نوعیت، ان کی تعیین اور ان کے اطلاقات کی پوری سائنس ہے، جو غامدی صاحب نے اپنی کتابوں اور لیکچرز میں پیش کر دی ہے۔

یہ درست ہے کہ قرآن مجید سے رہنمائی حاصل کرنے سے متعلق عام قاری کو جب یہ باور کرایا جاتا ہے کہ قرآن اپنے قاری سے براہ راست مخاطب نہیں ہوتا، بلکہ اولین مخاطبین کی سرگذشت کی صورت میں خطاب کرتا ہے تو کوہِ طور کی سیر کو آیا سادہ لوح قاری کچھ دل شکنی سی محسوس کرتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ خود کو قرآن کا براہ راست مخاطب سمجھنے کا زاویہ بعض اوقات بڑے غلط نتائج تک لے جاتا ہے۔ مثلاً:

'یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا' کے مخاطب مخلص صحابہ بھی تھے، کم زور اہل ایمان بھی اور منافقین بھی، جو ایمان کا دعویٰ کرتے تھے۔ ایک عام قاری اگر ہر بار اس خطاب کا مخاطب خود کو سمجھ لے تو اسے بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

قرآن مجید رسول سے کہتا ہے کہ تم اپنے مخالفوں پر فتح یاب رہو گے، اس دین کو سرزمین عرب میں غالب کرو گے، اُدھر صحابہ سے بھی فتح و نصرت اور خلافت ارضی دیے جانے کے وعدے کرتا ہے، اِدھر ایک عام مسلمان ان بشارتوں اور وعدوں کو خود سے منسوب کر لیتا ہے تو وہ فضاے بدر پیدا کر کے بے تیغ و سپر دشمنوں سے جا بھڑتا ہے، اور امید کرتا ہے کہ گردُوں سے فرشتے اس کی نصرت کے لیے قطار اندر قطار اترتے ہی ہوں گے، مگر جب ناکام ہوتا ہے تو اسے سمجھ نہیں آتا کہ اپنے ایمان پر شک کرے یا خدا کے وعدوں پر۔

قرآن مجید میں خدا نبی سے کہتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مشکلات کے بعد آسانی آنے والی ہے اور یہ ضرور آئے گی، اور یہاں اپنے کاروباری مشکلات کے بعد آسانی ملنے کی امیدیں لگالی

---

[1] ۔ الاحزاب 59:33۔ 'ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ'، (اِس سے امکان ہے کہ الگ پہچانی جائیں گی تو ستائی نہ جائیں گی۔)

جاتی ہیں، جو کبھی پوری ہوتی ہیں اور کبھی نہیں۔

خدا اعلان کرتا ہے کہ حق ضرور غالب آ کر رہے گا اور ادھر مسلمان عدالتوں سے اپنے مقدمات میں انصاف ملنے کی امید میں عمریں گزار دیتے ہیں، مگر ان کے حق کو فتح نہیں ملتی۔ پھر شکوہ اور جواب شکوہ کا ناختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

یہ معاملہ یہاں تک پہنچا کہ پیغمبر نے خدا کے حکم پر منکرین حق کو مباہلہ کا چیلنج دیا تو یہاں مسلمانوں نے بھی مباہلہ کے چیلنج دے دیے، مگر فریق مخالف پر خدا کا عذاب نشانِ حق بن کر نازل نہ ہوا۔

قرآن جو پیغام ایک پیغمبر کی سرگذشت کے حوالے سے دیتا ہے، جو نشانِ حق وہ قائم کرتا ہے، آخرت کی جواب دہی کا جو مسئلہ وہ سامنے رکھتا ہے، تزکیہ و تطہیر کا جو لائحۂ عمل وہ پیش کرتا ہے، وہ سب نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور اپنی دنیا کے مسائل حل کرنے میں اپنی ناکامی کو قرآن اور اسلام پر تھوپ دیا جاتا ہے۔

علوم دینیہ کی کلاسیفیکیشن

غامدی صاحب کے فکر پر ایک اعتراض علوم دینیہ کی زمرہ جاتی تقسیم (کلاسیفیکیشن) پر اٹھایا گیا ہے۔ جاننا چاہیے کہ علوم کے ارتقا میں وہ مرحلہ آتا ہے جب وہ کلاسیفیکیشن کے مرحلے سے گزر کر منقح ہوتے ہیں۔ یہ علمی ارتقا کی اہم ترین منزل ہوتی ہے۔ علوم دینیہ میں کلاسیفیکیشن کا یہ کارنامہ اپنی نہایت میں غامدی صاحب کے ہاتھوں عمل پذیر ہوا ہے۔ اس نے دین میں خلطِ مبحث کا خاتمہ اور استدلال کی بنیادوں کی تنقیح کر دی ہے۔ اہل علم اس کی اہمیت اور اس کی بُنت کی نزاکتوں کی پذیرائی کر رہے ہیں۔ جناب ڈاکٹر عمار خان ناصر نے فکر غامدی میں علوم دینیہ کی اس کلاسیفیکیشن کے نتائج کو درج نکات میں پیش کیا ہے:

1۔ پیغمبر کے دیے ہوئے دین اور اس پر مترتب ہونے والے علوم وافکار کے مابین امتیاز (اور نتیجتاً دینی روایت کو دین کے مقام پر فائز کر دیے جانے کے مفاسد کا ازالہ)۔

2۔ بنیادی مصادر کی روشنی میں دینی روایت کے نتائج فکر اور رجحانات کی تنقید کا تسلسل۔

3۔ امت کے متواتر تعامل (سنت) اور اخبار آحاد کے درمیان گم گشتہ امتیاز کی از سر نو دریافت

(اور نتیجتاً اساسی دین کی تاریخی قطعیت کا اثبات)۔

4۔ قرآن کے متن کے ساتھ تعامل کے علمی اصولوں کی، زیادہ دقت (precision) کے ساتھ تعیین و تنقیح (اور نتیجتاً ہر الم غلم چیز کو کسی نہ کسی طریقے سے متن کے ساتھ نتھی کر دینے کے رجحان کا سدباب)۔

قرآن کی تاویلِ واحد

فکرِ فراہی میں نظمِ کلام کی بنیاد پر قرآن کی تاویلِ واحد، یعنی لفظ اور جملے کے ایک معنی اور ایک مفہوم کی تعیین کے تصور پر بھی کچھ ناقدین کو اعتراض ہے۔ کلام فہمی میں سیاق و سباق کی اہمیت ایک مسلّمہ امر ہے۔ غامدی صاحب قرآن فہمی کے لیے اسی مسلّمہ اصول کو پوری طرح برتنے کی سفارش کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں کلامِ الٰہی کی واحد مراد متعین ہو کر سامنے آتی ہے۔ فہم کلام سے یہی مقصود ہوتا ہے، مگر معترضین کا اصرار ہے کہ یہ مسلّمہ باقی ہر کلام میں برت لیا جائے، مگر کلام الٰہی کو اس سے مستثنیٰ رکھا جائے تاکہ خدا کا کلام قطعی معانی نہ دے اور ہر کسی کے لیے اس میں اپنا معنی ڈالنے کی گنجایش باقی رہے۔ یہ ضد، غور کیجیے تو علم و ایمان کے لیے بڑے خطرے کی چیز ہے۔ نظمِ کلام، انتشارِ معانی کے دروازے کو بند کرتا اور قرآن کی اس حیثیت کو نمایاں کرتا ہے جو اس نے اپنے لیے خود متعین کی ہے کہ وہ دینی معاملات میں اختلافات کا فیصلہ کرنے آیا ہے۔ اگر قرآن سے کوئی فیصلہ کن بات متعین ہی نہیں کی جاسکتی تو قرآن کا یہ دعویٰ بے معنی اور اس کی افادیت معطل ہو کر رہ جاتی ہے۔ ہمارے مفسرین بھی ایک سے زائد معانی کے احتمال کی صورت میں وجہِ ترجیح قائم کرتے ہیں۔ یہی چیز فکر غامدی میں نظم کلام اور لسانی دلالتوں کے مسلّمہ اصولوں کی روشنی میں طے کی جاتی ہے۔ تاہم اس میں یہ گنجایش رہتی ہے کہ ہمارا سمجھا ہوا مفہوم، ممکن ہے درست نہ ہو، مگر دوسرے مفہوم کی درستی کا فیصلہ بھی نظم کلام اور لسانی دلالتوں کی راہ ہی سے ہو گا۔ تاویل بہر حال واحد ہی ہو گی۔

نتائجِ فکر میں قطعیت

ایک اعتراض غامدی صاحب کے ہاں دلیل یا نتائج کی پیشکش میں قطعیت یا جزم کے اظہار پر

بھی کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غامدی صاحب کے ہاں قطعیت احتمال کے اسی عمومی دائرے کے اندر ہوتی ہے جس کا لحاظ ہر صاحب علم کرتا ہے۔ غامدی صاحب کے بارے میں جس قطعیت پر اعتراض کیا جاتا ہے، غور کیجیے تو وہ ہر اہل علم کے ہاں پائی جاتی ہے۔ غامدی صاحب کے ناقدین کے بیانات ہی میں اس کے مظاہر دیکھ لیے جاسکتے ہیں۔

دین، فرد اور اجتماع کا تعلق

فکرِ غامدی میں فرد اور اجتماع کے تعلق پر بھی سوال اٹھائے گئے ہیں۔ فرد اجتماع سے الگ کسی ہستی کا نام نہیں ہے، افراد ہی کے مجموعے کا نام اجتماع ہے۔ افراد جب اجتماع تشکیل دیتے ہیں تو دین کے معاشرتی احکام ان سے بھی مخاطب ہو جاتے ہیں۔ ان احکام کو غامدی صاحب کی کتاب ''میزان'' میں ''قانون سیاست''، ''قانون جہاد''، ''قانون معیشت'' وغیرہ کے ابواب میں دیکھ لیا جاسکتا ہے۔

فکرِ غامدی میں دین فرد سے اجتماع کی طرف صعود کرتا ہے، اجتماع سے فرد پر نفوذ نہیں کرتا۔ اس لیے فکر غامدی کی اپروچ میں یہ صورت حال پیدا نہیں ہو سکتی ہے کہ مثلاً مردوں کو ڈاڑھیاں رکھوانے اور عورتوں کو حجاب کرانے کے لیے ریاستی طاقت استعمال کی جائے۔

مسلمانوں کے سیاسی غلبے سے عدم دل چسپی

دنیا میں مسلمانوں کے غلبے کی کاوشوں کی عدم پذیرائی کا الزام بھی غامدی صاحب کے فکر پر عائد کیا جاتا ہے۔ اس بارے میں غامدی صاحب کا موقف یہ ہے کہ مسلمانوں کی اگر یہ خواہش ہے کہ ان کا کوئی سیاسی بلاک بنے اور وہ دنیا میں آبرو مند ہوں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ نقطۂ اعتراض صرف یہ ہے کہ اس خواہش کو دینی تقاضا بنا کر پیش نہ کیا جائے، اس لیے کہ اس کی کوئی دینی بنیاد نہیں ہے۔ دین کی فہرست میں یہ زیر بحث نہیں آتا۔ اس پر غامدی صاحب مفصل نقد پیش کر چکے ہیں۔ مظلوم مسلمانوں کو ان کی نصیحت یہ ہے کہ وہ اپنے سے کئی گنا طاقت ور دشمن کو ہتھیاروں کے ذریعے سے شکست دینے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، مسلم اقوام بھی ان کی مدد کرنے

کی طاقت اور جرأت نہیں رکھتیں، اس صورت حال میں ان کے لیے واحد قابلِ عمل حل یہی ہے کہ وہ مظلومانہ جدوجہد کریں، خود کو پرامن رکھیں اور اپنی تعلیمی اور معاشی حالت کی درستی پر توجہ مرکوز کر دیں۔

غامدی صاحب بھی مسلمانوں کو آبرومند دیکھنا چاہتے ہیں، مگر ان کے نزدیک آبرومندی کا راستہ علم کی پرامن راہ سے ہو کر گزرتا ہے، خاک وخون کی وادیوں میں زار وزبوں ہو کر نہیں۔

محمد ذکوان ندوی

'کلمۂ اسلام' کی عظمت

ایک مومن کے لیے اِس سے بڑا کوئی اعزاز نہیں کہ وہ صرف اللہ کا بندہ اور رسول کا امتی ہے، نہ کہ دوسرے کسی اور شخص یا فکر و نظریے کا اسیر۔ اِس کلمۂ اسلام کا یہ اوّلین تقاضا ہے کہ انسان صرف اللہ کو اپنا معبودِ برحق و وحدہٗ لاشریک خدا تسلیم کرے، اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پورے دل و جان سے اپنا مطاعِ مطلق قرار دے۔ چنانچہ اللہ کے سوا نہ کوئی اُس کا معبود ہے، اور نہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے سوا کسی اور زندہ یا غیر زندہ ہستی کو یہ حیثیت حاصل ہے کہ وہ رسول جیسے مطاعِ مطلق قائد اور رہنما و امام کا درجہ پا سکے۔

خدا اور رسول، دونوں میں سے کسی ایک کی اِس استثنائی حیثیت کے متعلق کوتاہی اور بے شعوری عملاً 'کلمۂ اسلام' کی تصغیر اور اُس کے ساتھ دغا و بے وفائی کے ہم معنی ہو گا۔ اسلام کا یہ کلمہ سادہ معنوں میں، محض ایک کلمہ نہیں، بلکہ وہ ایک ایسا انقلابی نظریۂ حیات ہے جو ایک سچے مومن کو تمام معبودانِ باطل کی بندگی اور تمام بتانِ رشتہ و پیوند کی قید سے آزادی عطا کرتا ہے۔

گویا یہی 'کلمۂ اسلام' وہ "ایک سجدہ" ہے جو آدمی کو تمام "سجدوں" سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ ایک خدائے واحد پر ایمان دوسرے تمام 'خداؤں' سے بلند اور رسولِ برحق کی رسالت کا اقرار دوسرے تمام مفروضہ رہنماؤں کی غیر مشروط رہنمائی سے آزاد کر دیتا ہے۔ یہ ایمان تمام مربیین و اساتذہ کو انتہائی محترم بناتا ہے، مگر اِس استفادہ و احترام سے ہٹ کر، رسولِ برحق کے سوا کسی اور نظریہ و انسان کو غیر مشروط اطاعت کا مقام دینے کی نفسیات کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیتا ہے،

جس میں آدمی کی اپنی شخصیت اور اُس کا پورا وجود ہمیشہ کے لیے ایک کورانہ تقلیدِ محض کا اسیر بن کر رہ جائے، یہاں تک کہ وہ جب بھی دیکھے تو اُسی کے ذہن سے اور سوچے تو ہمیشہ اُسی کے متعین کردہ خطوط پر سوچے۔

اِس موقع پر ترجمانِ حقیقت ڈاکٹر اقبال کا ایک قیمتی شعر راقم کے ذہن میں گونج رہا ہے:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

یہاں ایک لطیف ترمیم کے ساتھ یہ شعر پیش خدمت ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

یہ ایک 'کلمہ' جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار 'کلموں' سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

یہی 'کلمۂ اسلام' وہ اصل ربانی آئیڈیالوجی اور راہِ فکر و عمل ہے جسے پوری طرح ماننے اور اختیار کرنے کا مطالبہ خدا کا دین ایک سچے مومن سے کرتا ہے۔ یہی 'کلمۂ اسلام' وہ 'شجرۂ طیبہ' (ابراہیم 14:24-26) ہے جو ہر موقع پر اہل ایمان کے لیے سایۂ رحمت بن کر ایک خزاں ناآشنا درخت کی مانند لہلہاتا رہتا ہے:

یہ نغمہ فصل گل ولالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں، لا الٰہ الا اللہ!

اِس 'کلمۂ اسلام' کا دوٹوک فیصلہ ہے کہ خدائے وحدہٗ لاشریک کے سوا، اِس کائنات میں کوئی اور الٰہ و معبود نہیں، اور رسولِ برحق و پیغمبر آخر الزماں (حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے سوا کسی قائد اور رہنما کو یہ مقام حاصل نہیں کہ وہ ایک ایسے مطاعِ مطلق کا درجہ پا سکے جو مستند وحیِ ربانی پر مبنی ایک خالی از خطا (infallible) ماخذ کی حیثیت رکھتا ہو۔ اِس اعتبار سے، یہ 'کلمۂ اسلام' آدمی کے لیے سچے استغنا اور کامل حریت کے ایک ابدی اور ربانی پروانے کی حیثیت رکھتا ہے۔

سید ابوالحسن علی ندوی

فراہی سیمینار میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کا خطاب

(مولانا ابوالحسن علی ندوی کی تقریر، جو انھوں نے سن 1991ء میں "امام فراہی سیمینار" کے موقع پر مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر (اعظم گڑھ) میں کی تھی۔)

[مختارات کا حصہ قدیم و جدید مصنفین کی منتخب تحریروں کے لیے مخصوص ہے۔ اس کا مقصد ماضی اور حال کے فکر و نظر کو قارئین کے سامنے پیش کرنا ہے۔ اس میں ماضی کے نمایندہ اہل علم کی تصانیف سے ایسے اقتباس نقل کیے جاتے ہیں، جو ان کے افکار اور اسالیب کو نمایاں کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ نئے لکھنے والوں کی موثر اور معتبر تحریروں کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ اِس حصے کے مندرجات سے مدیر اور ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ ادارہ]

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم. الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین محمد واٰلہ وصحبہ أجمعین ومن تبعھم بإحسان ودعا بدعوتھم إلی یوم الدین.

جناب صدر، معزز حاضرین مجلس، میں اس اعزاز کے لیے جو مجھے اس موقر، وقیع، ایک طرح سے آزمایشی مجلس کے افتتاح کے لیے بخشا گیا ہے، تشکر و ممنونیت سے زیادہ، مجھے معاف کیا

جائے، خادمانہ شکایت کا اظہار کرتا ہوں کہ مجھے ایک بڑی آزمایش میں ڈالا گیا ہے، لیکن اگر اس کے لیے کوئی جواز ہے تو یہ کہ میں مولانا حمید الدین فراہی کے مکتب فکر اور ان کی تصنیفی اور فکری دانش گاہ کا ایک حقیر طالب علم ہوں، اور آپ کے سامنے پوری دیانت اور صداقت کے ساتھ یہ عرض کروں گا کہ میں اپنے زمانۂ طالب علمی میں بھی اور جب مجھے دار العلوم ندوۃ العلماء میں شعبۂ تفسیر میں تدریس کا موقع دیا گیا تو قرآن مجید کے ایک خادم کی حیثیت سے تفسیر کا درس مجھ سے متعلق کیا گیا تو اس وقت میں نے بہت عمق، سنجیدگی اور محنت کے ساتھ مولانا کی تصنیفات کا مطالعہ کیا اور اس سے پورا استفادہ کیا۔ جب 1956ء میں مجھے دمشق یونیورسٹی کی طرف سے دعوت دی گئی تو میں مولانا کی کتابیں اپنے ساتھ لے گیا تھا اور خاص طور پر ''جمہرۃ البلاغۃ''، جس سے میں تاریخ ادب عربی اور عربی ادب کے ایک طالب علم اور کام کرنے والے، ایک غور کرنے والے طالب علم کی حیثیت سے بہت متاثر تھا، اس کو میں خاص طور پر لے گیا اور میں نے وہاں کے ایک بڑے نقاد اور ادیب استاذ محمد المبارک سے جو میرے دوست تھے اور جس جامعہ اور دانش گاہ نے مجھے دعوت دی تھی، وہ اس کے ایک بڑے استاد تھے اور پیرس یونیورسٹی سے بھی انھوں نے تحقیقی کام کیا تھا، میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ ''جمہرۃ البلاغۃ'' پر مقدمہ لکھیں اور اس کو یہاں کسی بڑے وقیع ادارے کی طرف سے مثلاً ''المجمع العلمی العربی'' دمشق کی طرف سے شائع کریں۔ افسوس ہے کہ یہ کام نہیں ہو سکا۔ میں نے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے بھی (اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت دے) لاہور کے قیام میں ایک مجلس میں بہت اصرار کے ساتھ کہا کہ عالم عربی کو مولانا حمید الدین صاحب کے ادبی مقام سے اور ادب عربی کے رمز آشنا ہونے کی حیثیت سے، اور اس پر ناقدانہ اور مبصرانہ نظر رکھنے سے جو چیز واقف کر سکتی ہے آسانی کے ساتھ، وہ ''جمہرۃ البلاغۃ'' ہے۔ اس کو شائع ہونا چاہیے۔ افسوس ہے کہ یہ کام ابھی تک نہیں ہو سکا۔

اس سلسلے میں مجھے اجازت دیجیے کہ میں ایک حرف شکایت بھی آپ کے سامنے پیش کروں کہ ایسے مذاکرات علمی کی اصل قدر و قیمت و فائدہ اس میں ہوتا ہے کہ کچھ نظر وسیع ہو اور کچھ ذمہ داریوں کا احساس ہو۔ مولانا حمید الدین صاحب کا جیسا تعارف عالم عربی میں ہونا چاہیے تھا، افسوس ہے کہ نہیں ہو سکا اور اس میں ان کی تصنیفات کی اور ان کے اظہار بیان کی طاقت کی یا ان کے فکر کی کوئی خامی نہیں، اس کی ذمہ داری آپ ہی پر نہیں، بلکہ ہم پر بھی آتی ہے اور میں اس

میں ندوۃ العلماء کو بھی شریک کروں گا کہ مولانا کا جیسا تعارف عالم عربی اور ہندوستان سے باہر عالم اسلام میں ہونا چاہیے تھا، وہ نہیں ہو سکا۔ اگر یہ ہوا ہوتا تو آج ہمیں اپنے سامنے یہ وقیع اور محبوب چہرے ہی نظر نہ آتے، جن کا تعلق ہندوستان سے ہے، بلکہ ایک بڑی تعداد یہاں عرب فضلا کی بھی نظر آتی، ممکن ہے کہ اس میں آپ کی انتظامی دقتوں کو یا وقت کی کمی کو بھی دخل ہو، لیکن اس میں اس وقت اس کو یہ بڑا دخل ہے کہ ان کا تعارف جیسا ہندوستان میں، اس برصغیر میں ہوا، وہ عالم عربی میں، مصر میں، شام میں اور مغرب اقصیٰ وغیرہ میں نہیں ہو سکا۔ یہ ذمہ داری ہے فضلاے "الاصلاح" کی اور میں فضلاے "ندوۃ العلماء" کو بھی اس میں شامل کرتا ہوں کہ اصل میں یہ دونوں ایک ہی خاندان کے دو حصے ہیں اور الحمد للہ شروع سے اس وقت تک مجھے ایسا ہی خاندانی احساس رہا ہے اور یہ ہماری ذمہ داری ہے، اس کو ہمیں پورا کرنا چاہیے۔

اس کے بعد میں یہ عرض کروں گا کہ بارھویں صدی کے ایک جلیل القدر عالم اور نقاد علامہ شوکانی نے جو اپنی مجتہدانہ تصنیف "نیل الاوطار" کے ذریعہ سے روشناس ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ مفسر بھی ہیں اور "فتح القدیر" کے مصنف بھی ہیں، انھوں نے ایک بات لکھی ہے بڑے نکتے کی، وہ میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں، وہ کہتے ہیں کہ علوم اسلامیہ کی چار قسمیں ہیں: ایک علم وہ ہے جو پکا اور جل گیا، ایک علم وہ ہے جو پکا، لیکن جلا نہیں اور ایک علم وہ ہے کہ جو نہ پکا، نہ جلا تو جس علم کو کہتے ہیں 'نضج واحترق'، جو پکا، پختگی کو پہنچا اور جل گیا۔ یہ مذمت کی چیز نہیں ہے، بلکہ اس کے کمال کا اظہار ہے کہ اپنے نقطۂ ارتقا کو وہ پہنچ گیا، وہ تو علم نحو ہے اور علم حدیث کو بھی غالباً (اگر میرا حافظہ کوتاہی نہیں کرتا تو) اس میں شامل کیا کہ اس میں کسی اضافے کی گنجایش نہیں ہے۔ نحو میں اب قیل وقال (نحو کی زبان ہی میں کہتا ہوں) کی گنجایش نہیں ہے۔ نحو پر اتنا کام ہو گیا ہے کہ اب اس میں کوئی یہ کہے کہ یہ اصول غلط ہے، یہ اصول ہونا چاہیے اور یہ قیاس صحیح نہیں، اور یہ قیاس ہونا چاہیے، اور یہ مسئلہ نحو کا غلط ہے۔ یہ عربوں کا کام تھا، اہل زبان کا کام تھا اور پھر اہل زبان کے بعد جو اپنے وقت کے عبقری ترین انسان تھے، ان میں سے میں سیبویہ کا نام خاص طور پر لوں گا، انھوں نے اس کام کو ختم کر دیا۔ جہاں تک حدیث وروایات کا تعلق ہے، رجال کا تعلق ہے، وہ بھی اس میں شامل ہے۔ پھر اس کے بعد کہتے ہیں: وہ علم جو پکا، لیکن جلا نہیں، وہ علم فقہ ہے اور یہ صحیح کہا ہے کہ جب تک نسل انسانی باقی ہے اور دنیا میں تغیر کا عمل جاری ہے اور جب

تک انسانی زندگی میں تنوع اور انسانی زندگی کے مطالبات غیر محدود ہیں، اس وقت تک فقہ کو مکمل نہیں کہہ سکتے کہ فقہ میں تمام مسائل کی تدوین ہو چکی اور ہر چیز کا جواب موجود ہے۔ اس لیے کہ یہ استحسان، مصالح مرسلہ اور عرف کا میدان ہے اور اسی طریقے سے اجتہاد کا دروازہ کھلا رہے گا۔ پھر انھوں نے کہا ہے کہ وہ علم جو پکا بھی نہیں، جلا بھی نہیں، وہ علم تفسیر ہے، اور یہ الفاظ ڈرتے ہوئے میں نے ادا کیے ہیں، اس لیے کہ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ علم تفسیر پر کوئی کام نہیں ہوا، بلکہ وجہ یہ ہے کہ اس کی نسبت اللہ تبارک و تعالیٰ کے علم و کلام سے ہے اور انسانی زندگی سے ہے اور کائنات سے ہے، دنیا کے تمام انسانوں سے ہے اور انسانی ضروریات، فطرت انسانی سے ہے اور اس کی تحدید نہیں کی جا سکتی کہ اس کا پورا جواب دے دیا گیا اور اس کو مدون کر دیا گیا۔ تو واقعہ یہ ہے کہ علم تفسیر میں برابر اس کی گنجایش رہی کہ لوگ پیدا ہوتے رہے اور اضافہ کرتے رہے اور انھی میں اس عہد کے امام تفسیر حضرت علامہ حمید الدین فراہی بھی ہیں اور یہ قرآن مجید کی آیت بتاتی ہے کہ تفسیر کو ہم کسی مکانی رقبے یا زمانی رقبے یا علم انسانی کے رقبے سے مقید اور محدود نہیں کر سکتے۔ صاف قرآنی آیت ہے: 'ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ. تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ'۔[1] اس میں یہ بتایا گیا کہ نہ قرآن مجید کی مساحت مکانی اور نہ اس کا مکانی رقبہ محدود کیا جا سکتا ہے کہ وہ کلمۂ طیبہ ہے جو شجرۂ طیبہ کی طرح ہے تو مکانی رقبہ اس لیے محدود نہیں کیا جا سکتا کہ 'تُؤْتِيْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِيْنٍ بِاِذْنِ رَبِّهَا' کہا کہ وہ ہر زمانے کے مطابق، ہر انسانی حالات میں تفاوت اور اختلاف کے مطابق اور فکر انسانی کے ہر سطح کے مطابق اور زمانے کے ہر تقاضے کے مطابق اور ذوق کی ہر تبدیلی کے مطابق اور ضروریات انسانی کے مطالبے کے مطابق وہ برابر پھل دیتا رہے گا، اس لیے ہمیں ذہن میں یہ بات رکھنی چاہیے کہ تفسیر کا علم وہ وسیع ترین علم ہے، یعنی علوم اسلامیہ میں نہیں، علوم انسانیہ میں وسیع ترین علم ہے، اس کو ہم کسی زمانے کے ساتھ محدود و مخصوص نہیں کر سکتے اور یہ نہیں سمجھ سکتے کہ اس کا خاتمہ ہو گیا اور یہ ہمارے مفسرین کرام خود حضرت علامہ حمید الدین فراہی کی خدا شناسی اور حقیقت شناسی تھی کہ ان میں سے کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اب قرآن

---

[1] ۔ابراہیم 14:24-25۔

مجید میں غور و فکر کی ضرورت نہیں ہے یا قرآن مجید میں غور و فکر کی اب کوئی گنجایش نہیں ہے۔ اگر بے ادبی نہ ہو اور شعر غزل کا نہ ہو تو میں یہ شعر پڑھوں گا کہ اقبال کہتے ہیں کہ:

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است

کبھی نہ سمجھنا کہ ساقی اپنا کام کر چکا اور مے خانہ میں سب کچھ موجود ہے۔ 'ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است' تشبیہ تو اچھی نہیں ہے، لیکن شاعری کی زبان یہی ہے۔ کیا کیا جائے کہ ہر زمانے میں شاعری کی ایک زبان رہی ہے، اس کے استعارے رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انگور کی شاخوں میں اب بھی بہت کچھ ہے، نچوڑنے والے نے اور اس سے شرابِ ناب بنانے والے یا آب حیات بنانے والے، شراب طہور بنانے والے نے کام نہیں کیا اور وہ اس کے قابو میں نہیں آیا۔ تو دونوں چیزوں کا ہمیں استحضار رکھنا چاہیے۔ میں مدرسے کے ایک خادم اور راہ علم کے یا منزل علم کے ایک مسافر کی حیثیت سے آپ سے کہتا ہوں، مخلصانہ مشورہ ہے کہ ہمیں ایک طرف اعتراف کرنا چاہیے اپنے عہد کے اس عالم رمز شناس، اس خدا شناس اور اس حقیقت شناس انسان کا کہ جس نے اپنے مقدور بھر اور توفیق الٰہی کے مطابق اور صحیح لفظ یہی ہے کہ اصل چیز توفیق الٰہی ہے، اگر توفیق الٰہی نہ ہو، اخلاص نہ ہو، خدا ترسی نہ ہو اور اس میں حقیقت پسندی اور طلب حقیقت نہ ہو تو اس کی کوئی بڑی قدر و قیمت نہیں، اس میں افادیت نہیں، اس کی افادیت مشکوک ہے، ہمیں یہاں اعتراف کرنا چاہیے کہ اپنے وقت کے فلاں عالم نے اور میں صفائی کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس وقت امام تفسیر حضرت علامہ حمید الدین فراہی نے جو کام کیا، کہا جا سکتا ہے کہ وہ ابھی تک نہیں ہوا تھا اور اس میں بہت سی انفرادیت کے پہلو ہیں۔

میں ایک تفسیر کے طالب علم، پھر معلم کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ تین چیزوں، خاص طور سے ان میں ربط آیات کے متعلق بھی یہ کہہ دوں کہ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اس پر کام نہیں ہوا۔ اطراف بمبئی کے، اس وقت تو بمبئی نہیں تھا، مشہور عارف حضرت علامہ مخدوم علی مہائمی کی کتاب ''تفسیر الرحمٰن و تیسیر المنان'' ربط آیات ہی پر ہے، اور یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ آپ ہی کی درس گاہ کے ایک فارغ التحصیل مولانا عبد الرحمٰن پرواز اصلاحی صاحب نے ان کی سوانح لکھی ہے۔ علامہ مہائمی کی سوانح ان کے قلم سے نکلی ہے اور انھوں نے ربط آیات کی کوشش کی ہے اور

اس کا اعتراف صاحب ''الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند'' اور صاحب ''نزہتہ الخواطر'' نے بھی کیا ہے اور اس زمانے کے ادبا و علما نے بھی کیا اور یہ سمجھا گیا کہ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ربط آیات پر اس طرح ایک جامع اور عمیق کوشش کی ہے۔ لیکن ادب کے ساتھ میں یہ عرض کروں گا کہ اس میں تصوف کا حصہ کچھ شامل ہو گیا ہے اور حضرت خضر سے استفادہ کا ذکر بار بار آتا ہے تو ربط آیات پر لوگوں نے کام کیا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ ربط آیات کو اس طرح جامع اور عمیق طریقے پر اور ربط آیات کو بنیاد بنا کر کہ صرف یہی نہیں کہ آیات باہم مربوط ہیں اور بیچ میں ان کے درمیان کوئی خلیج واقع نہیں ہے یا یہ کہ کسی قسم کا کوئی بُعد معنوی نہیں، بلکہ وہ ربط آیات، قرآن مجید کے نزول کے مقصد اور اللہ تبارک و تعالیٰ کے ہدایت بشری کے عام کلیے، جو اس کا طے کیا ہوا قانون ہے، اس کے ماتحت ہے، ربط آیات کا اتنا وسیع تخیل اور پھر اس کی تطبیق ایسی جس کی نظیر پچھلے کاموں میں بہت کم ملتی ہے۔ میں احتیاط کے ساتھ کہہ رہا ہوں، کہا جا سکتا ہے کہ نہیں ملتی۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے ذہن میں یہ بات رہے تاکہ علم کی منزل کا مسافر اپنے آپ کو فارغ نہ سمجھے، صرف وہ تاریخ پر بھروسا نہ کرے اور تاریخ کو دہرا دینا یا فخر کرنا ہی اس کا شعار نہ ہو، بلکہ یہ اس کے لیے مہمیز کا کام دے کہ ایک طرف تو یہ ہے کہ قرآن مجید پر جو کام جس زمانے میں ہوا، اس کے امتیاز کا ہم پورا اعتراف کریں اور اس میں اس وقت سب سے زیادہ ہمارے سامنے جو حقیقت ہے اور جس نے ہم کو آپ کو جمع کیا، وہ علامہ حمید الدین فراہی کا مجتہدانہ، بلکہ مجددانہ کام ہے فہم قرآن کے سلسلے میں اور ربط آیات کے سلسلے میں اور اقسام قرآن کے سلسلے میں۔ یہ میں کہنا بھول گیا تھا کہ ان کے کاموں کے تین حصے ہیں۔ میں نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں، جب میں تاریخ ادب عربی اور تفسیر قرآن، دونوں کا بہ یک وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاد تھا، اس وقت میں نے یہ تین پہلو محسوس کیے تھے ان کی انفرادیت کے: ایک ربط آیات، دوسرے اقسام القرآن۔ اقسام القرآن پر علامہ ابن قیم کا بھی رسالہ ہے اور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی شرح کی ہے اور لوگوں نے بھی، لیکن علامہ حمید الدین فراہی نے مستقل آیات اور سورتوں کا انتخاب کر کے اور اس میں اقسام جو بتاتے ہیں اور اقسام کا کیا تعلق ہے، کس طرح ذہن کو تیار کرتے ہیں، کس طرف اس کا رخ کرتے ہیں اور کیا مطابقت ہے اُن اقسام میں اور بعد کے مضامین میں، اس میں ان کی چیز اب تک آخری چیز ہے۔ اور تیسری چیز ''جمہرۃ البلاغہ'' ہے، جس

میں انھوں نے بلاغت عربی کو، عربی بلاغت کے اصول کو اور عربوں کے فہم و بلاغت کو اور عربوں کے ذوق بلاغت کو ترجیح دی ہے اور بتایا ہے کہ غیر عرب بلاغت کے تخیلات، فن بلاغت کے غیر عربی تخیلات اور عجمی تخیلات نے کیا اثر ڈالا ہے ہمارے متاخرین کی تصنیفات پر۔

تو میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ محض سیمینار کر لینا اور اس کا کامیاب ہو جانا اور یہاں اتنی موقر شخصیتوں کا شریک ہونا، یہ کافی نہیں۔ آپ علامہ حمید الدین کے کام پر طالب علمانہ اور اس کے ساتھ ساتھ مبصرانہ نظر ڈالیں اور تقابلی مطالعے کے ساتھ اور اس کے ساتھ ساتھ عالم عربی میں ان کا تعارف ہونا چاہیے اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ ابھی کام ختم نہیں ہوا ہے اور قرآن مجید میں 'تُؤْتِیْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا' ایک بہت بڑا اعلان ہے۔ اس میں ہمیں غور کرنے کا بہت کم شاید اتفاق ہوا ہو کہ اللہ تعالیٰ کس تحدی کے ساتھ کہہ رہا ہے، کس صراحت کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ شجرۂ طیبہ کی خاصیت ہے کہ 'تُؤْتِیْٓ اُكُلَهَا كُلَّ حِیْنٍۭ بِاِذْنِ رَبِّهَا'۔ اس کا زمانہ کسی مفسر پر، امام رازی پر ختم نہیں ہوا، جو مشہور ترین مفسر اور فلاسفۂ یونان کے مقابلے میں سب سے بڑے وکیل سمجھے جاتے ہیں اور جہاں تک قرآنی آیات کا تعلق ہے، ان فلاسفہ کے ایرادات کی تردید و جواب کے میدان میں ان کی انفرادیت مسلم ہے تو نہ ہم امام رازی کو آخری مفسر مانتے ہیں، نہ ہمیں کسی کے متعلق سمجھنا چاہیے۔ پوری عقیدت مندی کے ساتھ، ان کے لیے پوری دعا گوئی کے ساتھ، ان کا اپنے کو ممنون احسان سمجھنے کے ساتھ، ان کے مکتب کا ادنیٰ زلہ ربا اور گویا ایک گل چیں اور خادم سمجھنے کے ساتھ، ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ قرآن مجید وہ قیامت تک رہنے والی چیز ہے اور اس کے معانی نہ اس کے آفاق مکانی، نہ اس کے آفاق معنوی، نہ اس کے آفاق زمانی، نہ اس کے آفاق فہم کبھی ختم ہو سکتے ہیں۔ یہ قرآن مجید کے ان کے ساتھ، میں سمجھتا ہوں کہ اس کی حقیقت شناسی میں اگر کمی ہو گی تو ہم یہ سمجھ لیں گے کہ قرآن مجید پر جتنا کام ہونا تھا، سب ختم ہو گیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ پچھلے کاموں سے پورا استفادہ کیا جائے اور اس کے لیے برابر محنتیں کی جائیں، اس کے لیے اپنے اوقات کو اس پر صرف کیا جائے۔ میں ذرا تامل کے ساتھ کسی حد تک خوف کے ساتھ، بدگمانی کے خوف کے ساتھ اتنا عرض کروں گا کہ مجھے معاف کیا جائے جو حضرات علما موجود ہیں قرآن مجید کے پڑھنے والے، وہ شاید اس تقاضے کو سمجھ سکیں، جو مجھ سے یہ کہلوا رہا ہے کہ قرآن مجید کو خالص کسی کی مدد سے سمجھنا، اس کے نقطۂ نظر سے سمجھنا اور اس کے

زیر سایہ سمجھنا یہ صحیح نہیں ہو گا۔ اس لیے کہ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک چشمۂ صافی ہے، ایک چشمۂ حیوان ہے، آپ اس کے کنارے کھڑے ہیں، اس کے قریب کوئی درخت ہے، وہ درخت گلاب کا سہی، وہ درخت کسی بہتر سے بہتر مفید ترین ثمر کا حامل ہو، لیکن اس کا سایہ چشمۂ صافی پر پڑ رہا ہے تو وہ چشمۂ صافی اس طرح نظر نہیں آئے گا اور اس سے، اس کی عذوبت سے، اس کی صفائی سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکے گا، جیسا کہ اس وقت اٹھایا جاتا، جب تنہا چشمۂ صافی کو آنکھوں سے دیکھا جاتا اور سمجھا جاتا کہ یہ چشمۂ صافی اپنی جگہ پر خود کافی ہے، چشمۂ صافی نہیں، بلکہ چشمۂ کافی ہے۔ اس لیے میں اپنے مطالعۂ قرآن کے سلسلے میں، یہ بات بہت معذرت کے ساتھ اور تامل کے ساتھ عرض کر رہا ہوں، لیکن اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ کسی بڑی سے بڑی شخصیت کو قرآن اور اپنے درمیان اس کو حائل سمجھ لینا کہ اس کے بغیر ہم قرآن کو سمجھ ہی نہیں سکتے اور قرآن مجید اسی نے صحیح سمجھا ہے اور قرآن مجید اسی کے ذریعے سے سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ قرآن مجید کے ساتھ انصاف نہیں ہے، ناانصافی ہے۔ یہ چشمۂ صافی، اس کو بالکل اس طرح رواں رہنا چاہیے، اس پر کسی کا عکس تو پڑ سکتا ہے، اس کو کوئی روک نہیں سکتا۔ لیکن عکس کو باقی نہیں رہنا چاہیے کہ وہ عکس حائل ہو جائے، ہمارے اور اس کے استفادے کے درمیان حائل ہو جائے۔ جب یہ حقیقت سامنے رہے گی تو پھر اس کے بعد اس میں اضافہ ہوتا رہے گا اور اللہ تعالیٰ میں اس کی ہر وقت قدرت ہے کہ وہ پھر ان کے ساختہ پرداختہ مدرسہ اور دبستان فکر میں ایسے عالم اور ایسے شارح قرآن مجید کے پیدا کرے، جو کچھ اضافہ کریں اور کچھ اپنے وقت اور اپنے زمانے کے ذہن کے مطابق کچھ اور نئی چیزیں دیں۔

آخر میں آپ حضرات کے سامنے شکریہ ہی ادا نہیں کرتا، بلکہ ایک طرح سے شکایت کرتا ہوں اور معذرت بھی کرتا ہوں کہ میں اپنے طویل سفروں کی وجہ سے، بالکل حال میں ابھی میں دو طویل سفروں سے واپس آیا ہوں، کوئی چیز تحریری شکل میں تیار نہیں کر سکا جو آپ کے سامنے پیش کرتا، لیکن آخر میں پھر کہوں گا کہ عالم عربی میں تعارف کے لیے آپ کے یہاں اس کے لیے پوری تیاری ہونی چاہیے اور ان کے بارے میں عربی میں اچھے تعارفی مضامین ہونے چاہییں، جو وہاں کے رسائل میں چھپنے چاہییں۔ ایسے علمی و فود جانے چاہییں، جو اس پر خطبات دیں۔ محاضرات تیار کریں کہ علامہ حمید الدین فراہی کا کام، ان کا فہم قرآن، ربط آیات کے بارے میں ان کا مسلک اور ان کی کوششوں کا نمونہ، اقسام قرآن کے بارے میں ان کا جو کارنامہ ہے یا ان کا

جو فکر خاص ہے، وہ ”جمہرۃ البلاغہ“ کے سلسلے میں، میں عرض کروں گا کہ ضرورت ہے کہ اس کتاب کو غالباً ہمارے دوست استاذ محمد المبارک نے جو بہت بڑے ادیب و نقاد ہیں، وہ لیتھو میں چھپے ہونے کی وجہ سے یا اختصار کی وجہ سے جو علامہ حمید الدین فراہی کے فن تحریر میں بہت سے محققین اور قدما اور مجتہدین کے انداز پر اختصار پایا جاتا ہے، اس کی وجہ سے وہ اس کام کو نہیں کر سکے۔ لیکن اب بھی اس کام کی ضرورت باقی ہے اور گنجایش بھی ہے۔ اور یہ ایک بڑا کارنامہ ہو گا، اگر آپ کے یہاں سے کچھ لوگ ”جمہرۃ البلاغہ“ پر اس طرح جیسے ریسرچ کیا جاتا ہے، اس کو ایک موضوع بنا کر اس پر کام کریں اور مقدمہ لکھیں اور تقابلی مطالعہ اس میں ہو، اور بتایا جائے کہ مولانا نے کس طرح سے بلاغت عربیہ کو عربوں ہی کے ذوق اور قرآنی ذوق کی مدد سے سمجھا ہے، سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اس کتاب میں کیا انفرادیت ہے۔

میں ان الفاظ کے ساتھ، اگر میں نے اپنے مقام سے کچھ تجاوز کیا ہو اور بعض ایسی چیزیں یا خیالات میری زبان سے ادا ہوئے ہوں، جن سے غلط فائدہ اٹھایا جا سکے، میں یہ کہوں گا کہ نیت میری ہرگز نہیں تھی، لیکن ایسا ہوتا ہے، اگر ان سے غلط فائدہ اٹھایا یا غلط ترجمانی کی جا سکے تو میں اس کے لیے معذرت پیش کرتا ہوں، اور آپ حضرات کا جنھوں نے مجھے یہ اعزاز بخشا، شکریہ ادا کرتا ہوں۔ خدا کرے یہ سیمینار محض ایک یادگار نہ ہو، بلکہ ایک محرک ثابت ہو اور نئے دور کا آغاز ہو اور ایک نئے دور کی خالی تاریخی داستان نہ ہو۔ اس لیے کہ ہمارے اکثر سیمینار جو بڑی شخصیتوں کے بارے میں کیے جاتے ہیں، وہ ایک دور کی تاریخ ہوتے ہیں۔ تاریخ بن کر رہ جاتے ہیں کہ یہ ہوا اور یہ ہوا۔ یہ کارنامہ ہوا، لیکن وہ محرک نہیں ہوتے۔ دعا کرتا ہوں اور آپ حضرات سے استدعا بھی کرتا ہوں کہ اس کو محرک ہونا چاہیے اور اس کو منتہی الجیش نہیں ہونا چاہیے، مقدمۃ الجیش ہونا چاہیے، یہ ذہنوں کے لیے محرک ثابت ہو، علمی صلاحیت رکھنے والوں، خاص طور پر دبستان فراہی کے فضلا اور محققین اور طلبہ اور اہل قلم کے لیے اس کو محرک ہونا چاہیے کہ ابھی کن لائنوں پر، کن رخوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے تاکہ علامہ فراہی کا کام زیادہ روشن ہو اور ان کی روح زیادہ خوش ہو اور اضافہ ہو اسلامی کتب خانے میں اور اسلامی فکر کو ایک نیا مواد اور ایک نیا رخ ملے۔

و آخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العلمین۔

تحریر: علامہ شبیر احمد ازہر میرٹھی

ترتیب: ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

’اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ‘ کی شان نزول کی تحقیق

کیا ولید بن عقبہ فاسق تھے؟

(3)

حضرت ابن عباس کی طرف منسوب روایت:

ابن جریر نے لکھا ہے:

حدثنی محمد بن سعد ثنی ابی ثنی عمی عن ابیہ عن ابن عباس۔ قال کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بعث الولید بن عقبۃ بن ابی معیط الی بنی المصطلق لیاخذ منھم الصدقات وانہ لما اتاھم الخبر فرحوا وخرجوا لیتلقوا رسول رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وانہ لما حُدِّث الولید انھم خرجوا یتلقونہ، رجع الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال یارسول اللّٰہ، ان بنی المصطلق قد منعوا الصدقۃ فغضب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم غضبا شدیدا فبینما ھو یحدث نفسہ ان یغزوھم اذا اتاہ الوفد فقالوا یارسول اللہ انا حدثنا ان رسولك رجع عن نصف الطریق وانا خشینا ان یکون انما ردہ کتاب جاءہ منك فعضبت غضبۃ علینا۔ فانا نعوذ باللّٰہ من غضب اللّٰہ و غضب رسولہ فانزل اللّٰہ عذرھم فی الکتاب فقال:

''یایھا الذین اٰمنوا ان جاءکم فاسق''.[1]

اس حدیث کی سند بڑی تاریک ہے۔ اول تو ابن جریر طبری کی محمد بن سعد سے ملاقات ہی نہیں ہوئی، کیونکہ جب محمد بن سعد کا بغداد میں 230ھ میں انتقال ہوا ہے تو ابن جریر اپنی عمر کے چھٹے سال میں تھے اور اپنے وطن آمل میں رہتے تھے جو کہ طبرستان کی ایک بستی تھی۔ لہٰذا ابن جریر کا حدثنی محمد بن سعد کا کہنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ حالاں کہ ابن جریر ثقہ و ثبت ہیں پس دو ہی بات ہیں۔ یا تو یہ حدیث الحاقی ہے، کسی نے تفسیر ابن جریر میں درج کر دی ہے یا 'حدثنی' کا لفظ کسی کاتب یا ناسخ کا غلط اضافہ ہے پھر محمد بن سعد کے جو آبا و اجداد اور اسلاف اس سند میں مذکور ہیں علماے رجال ان میں سے اکثر کے ناموں سے بھی ناواقف ہیں، حالات کا اور ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کا تو ذکر ہی کیا! اس لیے یہ حدیث ناقابل اعتماد اور غالباً موضوع ہے۔

ناظرین یہ جملہ روایات میں نے اس لیے نقل کی ہیں کہ ان سے مولانا مودودی کی غلط بیانی واضح ہو جاتی ہے۔ مولانا مودودی نے لکھا ہے: بعض روایات میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی مصطلق کی سرکوبی کے لیے دستہ روانہ کر دیا تھا اور بعض میں یہ بیان ہوا ہے کہ آپ روانہ کرنے والے تھے۔ بہر حال اس بات پر سب متفق ہیں کہ بنی مصطلق کے سردار حارث بن ضرار ام المومنین حضرت جویریہ کے والد اس دوران میں خود ایک وفد لے کر حضور کی خدمت میں پہنچ گئے۔ مگر ناظرین دیکھ رہے ہیں کہ قتادہ، مجاہد، یزید بن رومان، عبد الرحمن بن ابی لیلیٰ، حضرت ام سلمہ، حضرت ابن عباس والی ان روایات میں سے کسی روایت میں بھی حارث بن ضرار کا ذکر نہیں ہے۔ سخت تعجب ہے کہ مودودی صاحب نے یہ صریح غلط بات کیسے لکھ دی جو موصوف سے پہلے کسی نے بھی نہیں لکھی۔ شاید انھیں خیال ہوا ہو گا کہ مطالعہ کرنے والوں میں سے ان روایات کو کون دیکھے گا۔ پس میرے لکھنے پر اعتماد کر لیا جائے گا۔

حارث کا ذکر صرف ایک روایت میں ہے، جو حارث سے ہی مروی ہے۔ اس کی تخریج امام احمد نے فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں:

---

[1]۔ تفسیر ابن جریر الطبری، سورۃ الحجرات، جزء الحادی والعشرون، بتحقیق: د، عبد اللہ بن عبد المحسن الترکی، مرکز البحوث للدراسات العربیہ والاسلامیہ بدار ھجر للنشر والتوزیع ص 350۔

حدثنا محمد بن سابق ثنا عیسی بن دینار ثنا ابی انه سمع الحارث بن ضرار الخزاعی قال قدمت علی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فدعانی الی الاسلام فدخلت فیہ واقررت بہ فدعانی الی الزکاۃ فاقررت بھا، وقلت یارسول اللّٰہ ارجع الی قومی فادعوھم الی الاسلام واداء الزکاۃ فمن استجاب لی جمعت زکاتہ فیُرسلُ الی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم رسولا لِ بان کذا وکذا لآتیك ما جمعت من الزکاۃ. فلما جمع الحارث الزکاۃ ممن استجاب لہ وبلغ الابان الذی اراد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان یبعث الیہ احتبس علیہ الرسول فلم یأتہ،فظن الحارث انہ قد حدث فیہ سخطۃ من اللّٰہ عزوجل ورسولہ فدعا سرٰوات قومہ فقال لھم ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کان وقت لی وقتا یرسل الی رسولہ لیقبض ماکان عندی من الزکاۃ ولیس من رسول اللّٰہ الخلف ولا اری حبس رسولہ الا من سخطۃ کانت، فانطلِقوا فنأتی رسول اللّٰہ

”عیسیٰ بن دینار نے اپنے باپ دینار سے روایت کی ہے کہ اس نے ضرار کے بیٹے حارث خزاعی سے سنا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے مجھے دعوتِ اسلام دی، میں نے قبول کرلی اور مسلمان ہو گیا، آپ نے مجھے ادائے زکوۃ کے بارے میں بتایا میں نے قبول کر لیا اورآپ سے کہا: یا رسول اللہ، میں اپنے قبیلہ واپس جارہا ہوں، انھیں اسلام اور زکوٰۃ کی دعوت دوں گا۔ جو لوگ مان لیں گے، ان کی زکوٰۃ جمع کر لوں گا۔ حضور فلاں فلاں وقت کوئی قاصد روانہ فرما دیں جو جمع شدہ اموالِ زکوٰۃ لے آئے۔ حارث نے ایسا ہی کیا، مگر وقت مقرر پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے کوئی قاصد نہ پہنچا۔ حارث کو گمان ہوا کہ خدا اور رسول شاید مجھ سے ناراض ہوگئے ہیں اس نے اپنی قوم کے سرداروں اور ذی اثر لوگوں کو جمع کر کے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصول زکوٰۃ کے لیے قاصد بھیجنے کا وقت مقرر فرما دیا تھا، وعدہ خلافی تو آپ کر نہیں سکتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کچھ ہم سے ناراض

صلی اللہ علیہ وسلم وبعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الولید بن عقبۃ الی الحارث لیقبض ماکان عندہ من الزکاۃ. فلما ان سار الولید حتی بلغ ببعض الطریق فرق فرجع فاتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقال یارسول اللہ ان الحارث منعنی الزکاۃ واراد قتلی فضرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم البعث الی الحارث، فاقبل الحارث باصحابہ اذا استقبل البعث وفصل من المدینۃ لقیھم الحارث قالوا ھذا الحارث فلما لقیھم قال لھم الی مَن بُعِثتم؟ قالوا الیك۔ قال ولم؟ قالوا: ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان بعث الیك الولید بن عقبۃ فزعم انك منعت الزکاۃ واردت قتلہ. قال لا والذی بعث محمدًا بالحق ما رأیتہ بتۃ ولا اتانی. فلما دخل الحارث علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال منعت الزکاۃ واردت قتل رسولی. قال والذی بعثك بالحق مارأیتہ ولا اتانی. وما اقبلتُ حین احتبس

ہو گئے ہیں۔ اس لیے خدمتِ اقدس میں چل کر تحقیق حال کرو۔ ادھر آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وقت مقرر پر ولید بن عقبہ کو بھیج دیا تھا، مگر وہ درمیان راہ سے ہی خوف زدہ ہو کر واپس ہو گیا اور آپ سے کہہ دیا کہ حارث نے زکوٰۃ بھی ادا نہیں کی اور مجھے قتل کر ڈالنے کی فکر میں پڑ گیا۔ آپ نے حارث کی سرکوبی کے لیے فوجی مہم بھیج دی۔ ادھر سے یہ لشکر اسلام چلا اُدھر حارث اپنے قبیلہ کے ذی اثر لوگوں کے ساتھ آرہا تھا۔ راستہ میں مڈبھیڑ ہوئی۔ حارث نے مسلمانوں سے دریافت کیا: آپ لوگ کہاں بھیجے گئے ہیں؟ بولے: تمھارے ہی پاس۔ حارث نے کہا: کیوں؟ انھوں نے کہا: اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمھارے پاس وصولیِ زکوٰۃ کے لیے ولید بن عقبہ کو بھیجا تھا۔ اس نے آکر بتایا کہ تم نے زکوٰۃ بھی نہ دی اور اس کے قتل کے درپے ہو گئے۔ حارث نے قسم کھا کر کہا: میں نے اسے قطعاً نہیں دیکھا نہ وہ میرے پاس آیا۔ پس جب حارث حاضر خدمت ہوئے تو آپ نے فرمایا: تم نے زکوٰۃ ادا نہیں کی اور میرے قاصد کو

علی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم خشیت ان تکون کانت سخطة من اللّٰہ عزوجل ورسولہ قال فنزلت الحجرات 'یاایھا الذین اٰمنو ان جاءك فاسق'.(مسند احمد 4/289)

قتل کر دینے کے فکر میں پڑ گئے؟ حارث نے قسم کھا کر کہا کہ نہ میں نے اسے دیکھا نہ وہ میرے پاس آیا۔ میں تو اس کا انتظار دیکھ کر اور نہ آنے پر یہ خیال کر کے کہ کہیں آپ ناراض تو نہیں ہو گئے، حاضرِ خدمت ہوا ہوں۔ اس پر سورۂ حجرات کی یہ آیت نازل ہوئی۔"

اس حدیث کی اسناد میں عیسیٰ بن دینار کا باپ دینار مجہول الحال و مستور ہے۔ 'قال ابن المدینی عیسی معروف ولا نعرف اباہ یعنی دینارًا'، (یعنی ابن المدینی نے کہا ہے کہ عیسیٰ تو معروف ہے، مگر ہم اس کے باپ دینار کو نہیں جانتے)۔ بخاری نے البتہ عیسیٰ بن دینار کو ثقہ قرار دیا ہے۔[2]

اس سے صرف یہ ہی ایک حدیث مروی ہے جو اس کے بیٹے عیسیٰ نے روایت کی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ علمی آدمی نہ تھا۔ لے دے کر جس کو ایک یہ ہی فضول سی حدیث یاد ہو، اس کے غیر علمی شخص ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے۔ رہا حارث بن ضرار خزاعی تو وہ بھی مجہول و غیر متعین ہے۔ مسند احمد میں تو حارث بن ضرار ہے، لیکن ابنِ اثیر جزری نے "اسد الغابہ" میں امام احمد کے طریق سے ہی اس کی تخریج کی ہے۔ اس میں حارث بن ابی ضرار ہے۔ حافظ ابن کثیر کا خیال ہے کہ یہ حارث بن ضرار ام المومنین جویریہ رضی اللہ عنہا کے والد اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خسر ہیں۔[3]

حافظ ابن عبد البر نے "الاستیعاب فی تذکرۃ الاصحاب" میں یہ لکھا ہے کہ اس حدیث کا راوی حارث بن ضرار کوئی اور شخص ہے۔ ام المومنین جویریہ رضی اللہ عنہا کے والد حارث بن ابی ضرار ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابن اثیر نے اس حدیث کی اسناد میں حارث بن ابی ضرار غلطی سے کہہ دیا ہے۔ حارث بن ضرار ہی ہونا چاہیے، جیسا کہ مسند احمد میں ہے۔

---

[2]۔ ملاحظہ ہو: تہذیب التہذیب 8/188، دار الفکر، بیروت، الطبعۃ الاولی، 1984ء۔

[3]۔ البدایہ والنہایہ 6/182، بتحقیق: د. عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی، مرکز البحوث للدراسات العربیہ والاسلامیہ بدار ھجر للنشر والتوزیع۔

میں کہتا ہوں کہ یہ حارث بن ضرار خزاعی مجہول شخص ہے۔ اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں قبیلہ بنی خزاعہ میں کوئی شخص حارث بن ضرار تھا تو نہ معلوم وہ اس قبیلہ کی کس شاخ میں سے تھا۔ بہر حال بنی مصطلق میں سے تو تھا نہیں، بنی مصطلق بھی قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ ہے اور اس قبیلہ کے اسلام لانے کا واقعہ معلوم و معروف ہے۔ وہ یہ کہ چونکہ اس قبیلہ نے غزوۂ احزاب میں مکہ کے مشرکین کا ساتھ دیا تھا، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبان 6ھ میں اس قبیلہ پر فوج کشی کی۔ تھوڑی دیر مقابلہ ہوا، مگر جلد ہی یہ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ آپ نے ان کی عورتوں اور بچوں کو گرفتار کر لیا۔ انھی میں حضرت جویریہ تھیں، جو بنی مصطلق کے سردار حارث بن ابی ضرار کی بیٹی تھیں۔ مدینہ پہنچ کر آپ نے انھیں اپنی زوجیت میں لے لیا۔ عام مسلمانوں نے اس قبیلہ کے تمام بچوں اور عورتوں کو جو مالِ غنیمت میں ان کے درمیان تقسیم ہو گئے تھے، یہ کہہ کر آزاد کر دیا کہ اب یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سسرالی رشتہ دار ہیں۔ ہم انھیں اپنی غلامی میں نہ رکھیں گے۔ یہ اطلاع بنی مصطلق کے لوگوں کو جو بہ وقت مقابلہ بھاگ نکلے تھے پہنچی تو وہ سب کے سب بہ خوشی حاضرِ خدمت ہو کر مسلمان ہو گئے۔ انھی میں حارث بن ابی ضرار بھی تھے۔ اب ظاہر ہے کہ حارث بن ضرار خزاعی نے اپنے اور اپنے قبیلہ کے مسلمان ہونے کا جو قصہ بیان کیا ہے، جو اس حدیث میں ہے وہ بنی مصطلق کے اسلام لانے کے واقعہ سے قطعاً مختلف ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دینار کوفی نے قتادہ و یزید بن رومان وغیرہ کی روایت سنی ہو گی۔ الٹا سیدھا تصرف کر کے اسے ہی بیان کر دیا ہے۔ پس مولانا مودودی کا اس حارث کو جزم کے ساتھ حضرت جویریہ کا باپ بتا دینا غلط ہے۔ اِس تفصیل سے روزِ روشن کی طرح آشکار ہو جاتا ہے کہ ان ساقط الاعتبار روایات پر اعتماد کر کے جن لوگوں نے آیت 'اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌ' کا شان نزول اس کہانی کو اور فاسق سے مراد ولید بن عقبہ کو بتایا ہے انھوں نے سخت غلطی کی ہے۔

اس بحث کے آخر میں ناظرین سے ایک بات اور کہتا ہوں، وہ یہ کہ بہ طور فرضِ محال اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ولید بن عقبہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اپنی عمر کے لحاظ سے اس لائق تھے کہ انھیں ذمہ داری کا منصب دیا جائے اور امین تحصیل بنا کر بھیجا جائے تو کیا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو ولید کا فاسق ہونا، صلاح و تقویٰ سے عاری ہونا معلوم تھا؟ اس سوال کا جواب کوئی بھی اثبات میں نہیں دے سکتا، کیونکہ یہ قطعاً ناممکن تھا کہ جو شخص کھلم کھلا فسق میں

ملوث ہو، جس کا فاسق ہونا معلوم و معروف ہو، اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم امینِ تحصیل بنا کر بھیجیں۔ پس اگر واقعی ولید بن عقبہ کو ہی آپ نے بنی مصطلق کے یہاں امین تحصیل بنا کر بھیجا تھا تو یقیناً وہ ظاہر الفسق نہ تھا۔ بہ ظاہر نیک و متقی ہی تھا، بلکہ صلاح و تقویٰ میں عام مسلمانوں کی سطح سے کچھ اونچا ہی ہو گا تبھی تو آپ نے اسے یہ حکم دیا تھا۔ اور سورۂ حجرات کی یہ آیت احکامِ حق کی پروا نہ کرنے والے ظاہر الفسق شخص کی لائی ہوئی خبر کے بارے میں مسلمانوں کو یہ ہدایت دے رہی ہے کہ اسے سن کر سچ نہ سمجھ بیٹھو، بلکہ اس کی تحقیق کر لیا کرو۔ کیونکہ جب وہ مخبر فاسق ہے تو ہو سکتا ہے کہ وہ خبر اس نے خود تصنیف کر لی ہو۔ پس آیت اس مخبر کے بارے میں ہے جو ظاہر الفسق ہو۔ جس کا فاسق ہونا معلوم و معروف ہو اور ولید نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ظاہر الفسق تھا، نہ ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے عہد میں۔

لہٰذا یہ آیت ولید کو متناول ہی نہیں ہے اور نازل و شانِ نزول میں مطابقت نہیں ہے۔ جب کسی آیت کے متعلق کوئی شان نزول مروی ہو، لیکن آیت میں اور اس میں مطابقت نہ ہو تو وہ شانِ نزول واجب الرد ہے۔ یعنی یہ نہیں سمجھا جائے گا کہ آیت اس بارے میں نازل ہوئی ہے، مثلاً اگر کوئی شخص کہے کہ: آیت 'اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ' عدتِ وفات کے بارے میں نازل ہوئی ہے کہ وہ چار ماہ دس دن ہے تو وہ بکواس کرتا ہے۔ اس کا یہ کہنا قطعاً غلط ہے۔ اس برہان کی رو سے ماننا پڑتا ہے کہ آیت 'اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌ' کی یہ شانِ نزول غلط ہے۔

ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ خالص جھوٹی کہانی پاؤں اس لیے چل گئی کہ حضرت عثمان کے عہد میں ان پر شراب پینے کا الزام لگا تھا اور ان پر شراب نوشی کی حد بھی نافذ ہوئی تھی۔ یہ الزام ان کے دشمنوں نے ایک سازش کے تحت لگایا تھا اور گواہی دینے والے دو شخصوں نے قطعاً جھوٹی گواہی دے ڈالی تھی۔ یہ اندوہناک واقعہ شرح و بسط کے ساتھ ہی ہم نے اپنی کتاب: "ارشاد الطالب شرح مسند علی بن ابی طالب" (اردو) میں لکھا ہے۔[4]

---

[4]۔ نیز کتاب شہادتِ عثمان رضی اللہ عنہ کا تاریخی پس منظر میں مختصراً ص 37 تا 64۔

ثاقب علی

کیا ہم نے کبھی غور کیا؟

کیا ہم نے کبھی سوچا کہ آج سے سو سال بعد اس دنیا میں ہمارا کوئی وجود نہیں ہو گا؟ یہ دنیا، جسے ہم اپنی زندگی کی کل حقیقت سمجھ بیٹھے ہیں، اُس وقت ہمارے لیے ماضی کا ایک دھندلا خواب بن چکی ہو گی۔ ہم اور ہمارے عزیز و اقارب زمین کی گہرائیوں میں دفن ہوں گے۔ ہماری محنت، ہماری جائدادیں، ہمارے خواب—یہ سب کسی اور کے قبضے میں ہوں گے۔

اس وقت کوئی ہمیں یاد نہیں کرے گا اور شاید ہمارا ذکر بھی نہ ہو۔ آج ہم میں سے کتنے لوگ اپنے پردادا یا پرنانا کے بارے میں جانتے ہیں؟ ان کے نام تک یاد نہیں۔ یہی ہماری حقیقت ہے اور یہی دنیا کی حقیقت ہے۔

دنیا کی حقیقت قرآن کی روشنی میں

قرآن مجید ہمیں بار بار یاد دلاتا ہے کہ یہ دنیا ایک دھوکا اور فریب ہے، جسے ہم آزمایش سمجھنے کے بجاے اصل زندگی سمجھ لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سورۂ حدید میں فرماتے ہیں:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّ لَھْوٌ وَّ زِیْنَۃٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَیْنَکُمْ وَ تَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَ الْاَوْلَادِ. (20:57)

”جان لو کہ دنیا کی زندگی محض کھیل تماشا، زینت، آپس میں فخر کرنا اور مال و اولاد کی زیادہ طلب ہے۔“

جب قیامت قائم ہو گی، تب دنیا کی زندگی کی حقیقت کا اندازہ ہو گا۔ لوگ حیران ہوں گے کہ

ہم کتنی مختصر مدت کے لیے دنیا میں رہے، جیسا کہ سورۂ مومنون میں ارشاد ہے:

قٰلَ كَمْ لَبِثْتُمْ فِي الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ. قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَسْئَلِ الْعَآدِّيْنَ.

(113-112:23)

”پوچھا جائے گا: تم زمین میں کتنے سال رہے؟ وہ کہیں گے: ایک دن یا کچھ حصہ، گننے والوں سے پوچھ لیجیے۔“

یہ بات اس دنیا کی بے ثباتی کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ سورۂ روم میں مزید وضاحت کی گئی ہے:

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ.

(55:30)

”اور جس دن قیامت قائم ہو گی، گناہ گار قسم کھا کر کہیں گے کہ ہم ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ٹھیرے۔“

زندگی کا اصل مقصد

ہماری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرمایا ہے کہ یہ دنیا آزمایش کا میدان ہے:

الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفُوْرُ.

(الملک 2:67)

”جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمھیں آزمائے کہ تم میں کون اچھے عمل کرتا ہے، اور وہ غالب اور بخشنے والا ہے۔“

یہ آزمایش ہمیں یہ سمجھانے کے لیے ہے کہ ہم اپنی زندگی کو نیکی، انصاف اور اللہ کی عبادت کے لیے وقف کریں، لیکن بد قسمتی سے اکثر لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ وہ اس وقت ہوش میں آتے ہیں جب موت ان کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہے، لیکن اُس وقت واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ جیسا کہ سورۂ مومنون میں ذکر ہے:

رَبِّ ارْجِعُوْنِ. لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ.(23:99-100)

”اے میرے رب، مجھے واپس بھیج دے، شاید میں نیک عمل کروں ان چیزوں میں جو میں چھوڑ آیا ہوں۔“

نجات کا راستہ

نجات کا راستہ قرآن نے واضح کر دیا ہے۔ ہمیں اپنا تعلق اللہ کے ساتھ مضبوط کرنا ہو گا اور اپنی زندگی کو قرآن و سنت کے مطابق ڈھالنا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ سورۂ فجر میں فرماتے ہیں:

يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ. ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً. فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ. وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ. (30-27:89)

”اے اطمینان والی جان، اپنے رب کی طرف لوٹ چل تو اس سے راضی، وہ تجھ سے راضی۔ پھر میرے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو جا۔“

اختتامیہ دعا

آخر میں ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں دنیا کی حقیقت کو سمجھنے، آخرت کی تیاری کرنے اور اپنی زندگی کو نیک اعمال سے بھرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ. (البقرہ 201:2)

”اے ہمارے رب، ہمیں دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھلائی دے، اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔“

ڈاکٹر عمار خان ناصر / ڈاکٹر سید مطیع الرحمن

مطالعۂ سنن ابن ماجہ

(سنن ابن ماجہ کی احادیث سے متعلق استفسارات اور ان کا جواب)

(2)

مطیع سید: آپ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف اوقات کی نمازوں میں کچھ خاص سورتیں پڑھتے تھے۔[1] کیا ان نمازوں کی ان سورتوں کے ساتھ کوئی خاص مناسبت تھی؟

عمار ناصر: میرے خیال میں یہ ایک ذوق کی بات ہے۔ کچھ سورتوں کی مناسبت شاید ہو، مثلاً سورۃ الجمعہ اگر جمعہ کے دن پڑھتے تھے تو اس کی ایک معنوی مناسبت بنتی ہے، لیکن اس طرح کی کوئی ظاہری مناسبت ہونا ضروری نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذوق کے تحت ایک معمول بنا لیا۔

مطیع سید: نماز میں تھوکنا یا رینٹ پھینکنا، اور حیض و نفاس، یہ شیطان کی طرف سے ہیں۔[2] احادیث میں اکثر اس طرح کی چیزوں کو شیطان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، حالاں کہ یہ فطری

---

[1] ۔ کتاب اقامۃ الصلوٰۃ والسنۃ فیھا، باب القراۃ فی صلوٰۃ المغرب، رقم 831۔

[2] ۔ کتاب اقامۃ الصلوٰۃ والسنۃ فیھا، باب ما یکرہ فی الصلوٰۃ، رقم 969۔

سی چیزیں ہیں۔ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ ہے کہ شیطان سے نفرت پیدا کی جائے، اگرچہ ان چیزوں کا شیطان سے کوئی تعلق نہیں ہے؟

عمار ناصر: جی ایسے ہی ہے۔ یہ فطری اور طبعی چیزیں ہیں، لیکن ان میں گندگی یا نجاست کا پہلو بھی ہے۔ تو یہ ادب ہمیں سکھایا گیا ہے کہ خیر کی باتوں کی نسبت اللہ کی طرف کرنی چاہیے اور شر کی باتوں کی نسبت شیطان کی طرف کرنی چاہیے۔ یہ اسلوب آپ کو عام نظر آئے گا۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خادم بھول گئے ہیں تو کہا کہ 'مَآ اَنْسٰنِیْهُ اِلَّا الشَّیْطٰنُ'، ''یہ شیطان ہی تھا جس نے مجھے غافل کر دیا کہ میں اُسے یاد رکھوں''۔[3] حضرت ایوب علیہ السلام مصائب میں مبتلا ہوئے تو کہا کہ 'اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّ عَذَابٍ'، (شیطان نے مجھ پر یہ تکلیف مسلط کر دی ہے''۔[4] شیطان نے مجھ پر یہ تکلیف مسلط کر دی ہے۔ انسان کو آزمایش میں ڈالنا شیطان کو پسند بھی ہے۔ مثلاً نماز میں وسوسے پیدا کرنا، دیگر چیزیں یاد دلانا، وہ یہ کرتا بھی ہے۔ تو اس مناسبت سے ہر بری چیز کی نسبت شیاطین کی طرف کر دی جاتی ہے، کیونکہ کئی بری چیزوں کا وہ سبب بن رہے ہوتے ہیں، کئی چیزوں پر وہ خوشی محسوس کرتے ہیں اور کئی جگہ شیاطین کی خبیث فطرت پر انسان کو متنبہ رکھنے کے لیے یہ نسبت کر دی جاتی ہے۔

مطیع سید: یہ مقصود بھی ہو سکتا ہے کہ لوگ جو نماز کے دوران میں تھوکتے ہیں تو وہ نہ تھوکیں؟

عمار ناصر: جی، کراہت دلانا مقصود ہے کہ نماز کی حالت میں ضبط کرو۔ یہ سمجھو کہ یہ ہم سے شیطان کرا رہا ہے، لہٰذا ہم نہ کریں۔

مطیع سید: عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے متعلق آتا ہے کہ وہ رکوع میں دونوں ہاتھ جوڑ کر رانوں کے درمیان رکھ لیتے تھے۔[5] علامہ وحید الزمان صاحب نے ابن ماجہ کی شرح میں ایک جگہ لکھا ہے کہ رکوع میں تطبیق کا طریقہ منسوخ ہو گیا تھا، لیکن ابن مسعود کو اس کا علم نہیں تھا اور وہ اس کے قائل رہے۔ اس کے علاوہ جنبی کے غسل، یتیم کے مال میں زکوٰۃ اور عورت کو چھونے

---

[3]۔ الکہف 18:63۔

[4]۔ ص 38:41۔

[5]۔ کتاب اقامۃ الصلوٰۃ والسنۃ فیھا، باب وضع الیدین علی الرکبتین، رقم 873۔

سے وضو کا ٹوٹ جانا، ان سب مسائل میں احناف نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی تقلید ترک کر دی، لیکن رفع الیدین کے معاملے میں وہ اڑ گئے۔ خود حضرت عمر جیسے صحابی پر کئی باتیں پوشیدہ رہ گئیں تو باقی کی کیا بات کی جا سکتی ہے۔ یہ انھوں نے لکھا ہے۔ میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ اگر یہ بات ٹھیک ہے تو رفع الیدین تو بہت بعد میں کسی مکتب فکر کا تشخص بنا ہو گا، لیکن ابتدائی دور میں تو یہ معاملہ نہیں تھا۔ کسی عمل کو چھوڑنے یا روایت لینے کی وجہ یہ تو نہیں ہو گی کہ فلاں گروہ یا مسلک سے کسی کا تعلق ہے۔ اس تناظر میں تو ان کا اعتراض درست معلوم نہیں ہوتا۔

عمار ناصر: اصل میں ہندوستان میں جو مناظرانہ ادب اس مسئلے پر پیدا ہوا، اس میں وجوہِ ترجیح بڑے انوکھے قسم کے آ گئے ہیں، جن کا فقہی روایت سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس طرح کی چیزیں باقاعدہ زیرِ بحث آتی ہیں کہ ٹھیک ہے، روایت تو آ گئی ہے، لیکن یہ دیکھنا چاہیے کہ کون سا عمل کون سا صحابی بیان کر رہا ہے۔ ادھر عبد اللہ بن مسعود ہیں، ادھر ان کے مقابلے میں عبد اللہ بن عمر ہیں۔ تو ان میں سے کس کے ہاں بھول جانے یا کسی حدیث سے ناواقف ہونے کی مثالیں زیادہ ہیں۔ اب یہ روایت پر کوئی علمی تنقید نہیں ہے۔ یہ راوی کی درجہ بندی سے روایت کی افضلیت ثابت کرنے والی بات ہے۔ اس تناظر میں تو وہ ایک پہلو سے ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں کہ عبد اللہ بن مسعود سے بھی تو کئی چیزیں مخفی رہ گئیں، کیونکہ ان کو ناسخ احکام کا علم نہیں تھا، لیکن ان کا رفع الیدین نہ کرنا احناف کو پسند آ گیا۔

مطیع سید: مثال کے طور پر ابن ماجہ کو ہی لیں، وہ روایت نقل کرتے ہیں اور بعض اوقات آخر میں لکھتے ہیں کہ اس میں فلاں راوی ضعیف ہے۔ جس روایت میں وہ ایسا تبصرہ نہیں کرتے تو گویا ان کے نزدیک وہ روایت بالکل صحیح ہے اور انھیں اس کے راویوں کے بارے میں تسلی ہے، لیکن جس کے متعلق وہ خود کہہ رہے ہیں کہ فلاں راوی ضعیف ہے تو پھر کیوں اسے درج کر رہے ہیں؟

عمار ناصر: امام ابن ماجہ نے اپنی کتاب کس اصول پر لکھی ہے، وہ اصول تو انھوں نے بیان نہیں کیے، جیسے امام ترمذی نے اپنے اصول بتائے ہیں، اس لیے ممکن ہے کہ کسی خاص راوی کے بارے میں وہ متنبہ تو کر رہے ہیں، لیکن اور طرق سے یا دیگر قرائن سے انھیں روایت کی صحت پر اطمینان ہے۔

مطیع سید: گویا انھوں نے جو روایت لی ہے، اس کی صحت کا اطمینان پیدا کر لیا ہے؟

عمار ناصر: یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے، ان کا اصول یہ ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک موضوع سے متعلق ایک روایت موجود ہے تو وہ نشان دہی کے لیے درج کر رہے ہوں۔ جیسے امام ابو داؤد ایک موضوع سے متعلق جو بھی اہم روایات ہیں، وہ لے آتے ہیں۔ ساتھ بتا بھی دیتے ہیں کہ یہ کم زور ہے، لیکن وہ درج کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ یہ روایت موجود ہے۔

مطیع سید: امام ابن ماجہ نے جب ایک روایت اپنی کتاب میں لکھی تو بہ ظاہر وہ ان کے نزدیک قابل قبول تھی، لیکن بعد میں شارحین کہتے ہیں کہ اس روایت میں فلاں راوی کم زور ہے، یعنی انھوں نے بعد میں راویوں کی جانچ کی ہے۔ جب فقہا احادیث لیتے ہیں تو ہم ان کے بارے میں کہتے ہیں کہ ممکن ہے، ان تک یہ روایت کسی صحیح سند سے پہنچی ہو، لیکن ہم تک جس سند سے آئی ہے، وہ کم زور ہے۔ یہی اصول ائمۂ محدثین پر بھی لاگو نہیں ہوتا؟ بعد کے شارحین بہت سے راویوں پر جرح کرتے ہیں، حالاں کہ محدثین کا فن ہی یہی تھا اور انھوں نے بڑی جانچ پرکھ کر کے روایت لی تھی۔

عمار ناصر: اس استدلال میں ایک وزن تو ہے کہ دیکھیں اس دور میں فقہا نے جو روایتیں قبول کیں، وہ اگرچہ محدثین کے جمع کردہ مواد کی روشنی میں صحت کے معیار پر پوری نہیں اترتیں، لیکن ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ کسی روایت کے ثبوت کے طرق یا اسناد وہی ہیں جو کتابوں میں درج ہیں، ان کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوں گے۔ اگر ہم اس امام کو علمی گنجایش دیتے ہیں یا اس کے موقف کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس امکان میں ایک وزن ہے کہ جو فقیہ ہے یا محدث ہے، اس نے روایت کی صحت کے جو بھی معیار مقرر کیے ہوں گے، ان کے مطابق اگر وہ مطمئن تھا تو اس کو حق ہے کہ وہ اس کو اختیار کرے۔ البتہ، اگر ہم تک ان طرق سے وہ نہیں پہنچی تو وہ ہماری معلومات کا پابند تو نہیں تھا۔ اس پہلو سے یہ بات ٹھیک ہے، لیکن دوسرے پہلو سے آپ دیکھیں کہ ہم نے آج اگر تحقیق کرنی ہے تو ہم تو اسی مواد پر مدار رکھیں گے جو ہم تک پہنچا ہے۔ ہم ایک قیاسی امکان کی وجہ سے تحقیق کا معیار تو نہیں بدل سکتے۔ تو اس سوال کو دیکھنے کے یہ دونوں زاویے ہو سکتے ہیں۔

مطیع سید: یہ بات بھی بڑی دل چسپ ہے کہ فقہا پہلے کام کر چکے ہیں اور محدثین بعد میں روایات جمع کر رہے ہیں۔ اگر اس کے برعکس محدثین پہلے یہ کام کر لیتے اور بعد میں فقہا آتے تو

شاید بالکل اور طرح کی صورت بنتی۔

عمار ناصر: جی، اگر ایسا ہوتا تو شاید چیزیں مختلف ہو جاتیں، لیکن تاریخی عمل تو اس طرح کی پیشگی ترتیب بنا کر نہیں ہوتا۔

مطیع سید: آپ نے ایک دفعہ ذکر کیا تھا کہ آپ کسی دور میں رفع یدین کرتے رہے ہیں۔ پھر آپ نے چھوڑ دیا یا اب بھی آپ کر لیتے ہیں؟

عمار ناصر: ایک دور میں ایک طرح کا رد عمل سا پیدا ہوا تھا کہ رفع یدین کی حدیثیں زیادہ صحیح ہیں تو ان پر عمل کرنا چاہیے۔ اسی دور میں کچھ عرصہ میں نے رفع یدین پر عمل کیا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی کر لیتا ہوں۔ خصوصاً جب آپ حرم میں ہوں تو وہاں ویسے ہی اس کا ماحول ہوتا ہے، اور ویسے ہی کرنے کو جی چاہ رہا ہوتا ہے، جیسے باقی لوگ کر رہے ہیں۔ نماز جنازہ میں تو مجھے عموماً احساس ہوتا ہے کہ تکبیر کے ساتھ رفع یدین بھی کرنا چاہیے، کیونکہ وہاں رکوع کی طرح ایک رکعت سے انتقال کی کوئی اور ظاہری علامت نہیں ہے۔

مطیع سید: حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ ایک حسین عورت مسجد میں نماز پڑھنے آتی تھی۔ کچھ لوگ اگلی صفوں میں بڑھ جاتے کہ کہیں اس پر نظر نہ پڑ جائے، کچھ جان بوجھ کر پچھلی صفوں میں پڑھتے کہ اسے دیکھ بھی لیں تو قرآن کی آیت نازل ہوئی کہ 'وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ'، ''ہم اُن کو بھی جانتے ہیں جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور اُن کو بھی جانتے ہیں جو بعد میں آنے والے ہیں'' (الحجر 15:24)۔[6] ابن عباس تو خود ترجمان القرآن ہیں، قرآن پر ان کی پوری نظر ہے۔ تھوڑا سا غور کریں تو ان آیات کا سیاق بالکل مختلف ہے اور وہاں یہ بات بیٹھ ہی نہیں رہی۔ لگتا نہیں کہ ابن عباس جیسے جلیل القدر مفسرِ قرآن نے یہ بات کہی ہو اور نہ یہ کہنا ممکن ہے کہ صحابہ کے ہاں سیاق وسباق کا لحاظ نہیں رکھا جاتا تھا۔

عمار ناصر: اس باب میں اگر شاہ ولی اللہ اور زرکشی وغیرہ، جنھوں نے اسباب نزول کی روایات پر غور کیا ہے، ان کی بات اگر آپ لیں تو وہ کہتے ہیں کہ صحابہ کی اصل میں مراد یہ نہیں ہوتی، یعنی وہ واقعتاً شانِ نزول نہیں بیان کر رہے ہوتے۔ وہ اصل میں استشہاد کر رہے ہوتے ہیں۔ یعنی اگر

---

[6]۔ کتاب اقامۃ الصلوٰۃ والسنۃ فیھا، باب الخشوع فی الصلوٰۃ، رقم 1046۔

کسی خاص واقعے پر قرآن مجید کی کسی آیت کے الفاظ منطبق ہو سکتے ہیں اور اس سے آپ استشہاد کر سکتے ہیں تو صحابہ استشہاد کے طور پر اس آیت کا ذکر کر دیتے ہیں اور اس کو یوں تعبیر کر دیتے ہیں کہ آیت اس واقعے کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ کسی چیز کا تاریخی پہلو بیان کرنا ان کے پیش نظر نہیں ہوتا۔

مطیع سید: بندے اور کفر کے درمیان ترکِ نماز کا فرق ہے۔[7] مجھے تو یوں لگتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم خاص طور پر مدینے کے ماحول میں جہاں منافقین بھی موجود ہیں، منافقین اور مسلمانوں کے درمیان فرق قائم کرنے کے لیے فرما رہے ہوں گے کہ یہ حدِ فاصل ہے، لیکن ہمارے فقہا کے ہاں اس کو بالکل ظاہری معنوں میں لیا جاتا ہے۔ امام احمد اور اصحابِ حدیث تارکِ نماز کو کافر قرار دیتے ہیں۔ مالک و شافعی کے نزدیک تو واجب القتل ہے، مثلِ مرتد ہے اگر توبہ نہ کرے۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک کافر تو نہیں، لیکن کفر کے قریب ہو جاتا ہے۔ کیا کوئی اس طرف نہیں گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خاص ماحول میں یہ بات فرما رہے ہیں اور وہاں تو ظاہری معیار یہی ہو سکتا تھا؟

عمار ناصر: یہ صرف ایک حدیث نہیں ہے، جس سے فقہا اتنے زیادہ پریشان ہو گئے ہیں۔ نماز کی اہمیت کو بیان کرنے والی حدیثیں مختلف ہیں۔ کچھ ہیں جو دین میں نماز کی اہمیت کو بیان کرتی ہیں، جیسے یہ حدیث ہے کہ عملاً ایک آدمی مسلمان ہے، یہ تو اصل میں اس کی نماز سے ہی پتا چلے گا۔ جو آدمی نماز ہی نہیں پڑھتا، اس کو یہ پروا نہیں کہ اللہ نے ایک فرض مجھ پر عائد کیا ہے تو میں اس کو ادا کروں، اس میں اور ایک کافر میں فرق کیا ہے؟ تو یہ حدیث تو اس پہلو کو بیان کر رہی ہے۔ فقہا جس پہلو سے اس کو قانونی مسئلہ بناتے ہیں، وہ اور بات ہے، اور وہ یہ کہ قرآنِ مجید نے بھی یہ شرط لگائی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کہ یہ لوگ جو اب مسلمان ہو رہے ہیں، ان کو قانونی طور پر مسلمان شمار کرنے اور ان کو جان و مال کا تحفظ دینے کے کچھ ظاہری شرائط ہیں، جو انھوں نے پورے کرنے ہیں۔ ان میں سے دو چیزیں نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا ہیں۔ اگر وہ بہ ظاہر کہیں کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں، لیکن شرائع اسلام میں سے ان دو چیزوں کی بھی پابندی نہیں کرتے تو

---

[7]۔ کتاب اقامۃ الصلوٰۃ والسنۃ فیھا، باب ماجاء فیمن ترک الصلوٰۃ، رقم 1078۔

ان کو ہم قانونی طور پر مسلمان کس بنیاد پر شمار کر سکتے ہیں؟ اصل میں یہاں سے فقہا کے ہاں بحث پیدا ہوئی کہ یہ بات اگرچہ گروہوں کے بارے میں کہی گئی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ پھر افراد پر بھی منطبق ہوتی ہے۔ جو مسلمانوں کے اندر رہتا ہے، کلمہ گو بھی ہے، نام بھی مسلمانوں والا ہے، لیکن وہ نماز کی پابندی بالکل نہیں کرتا، اس کو ہم کہاں رکھیں؟ تو فقہا کے ہاں، یہاں سے بحث پیدا ہوئی۔

مطیع سید: میں آج کی سوسائٹی کے اعتبار سے اس حدیث کو دیکھتا ہوں تو پھر مجھے یہ مسئلہ پیش آتا ہے کہ ہم سب مسلمان ہیں، ہمیں نماز کا حکم بھی معلوم ہے، لیکن محض سستی یا کم زوری کی وجہ سے اکثر لوگ نماز نہیں پڑھتے۔ تو ان کا کیا حکم ہے؟

عمار ناصر: یہاں دو معاملے ہیں: ایک یہ کہ دین میں نماز کی جو اہمیت ہے، وہ تو یہی ہے جو حدیث میں بیان ہوئی ہے۔ اس پہلو سے تو فرق نہیں ہے۔ آج بھی جب ہم لوگوں کے سامنے ان مسلمانوں کی حیثیت دین کی نظر میں بیان کریں گے جو نماز نہیں پڑھتے تو یہی بیان کریں گے۔ البتہ ان پر قانونی طور پر تارک نماز کے احکام کا اطلاق کرنے میں پھر مصلحت کا اصول آ جاتا ہے، اس لیے فقہا بھی یہ بحثیں کرتے ہیں، لیکن کوئی اس کی تنفیذ نہیں کرتا۔ قانونی تنفیذ ایک اور چیز ہو جاتی ہے۔

مطیع سید: ہماری آج کی سوسائٹی میں فقہا والی بحثیں تو قابل عمل دکھائی نہیں دیتیں۔

عمار ناصر: وہ اس لیے دکھائی نہیں دیتیں کہ اس طرح کے اقدام سے اصل میں جو نتیجہ مقصود ہے، وہ ہمارے حالات میں حاصل نہیں ہو سکتا۔ مقصود تو یہ ہے کہ مسلمان کو نماز کی پابندی کرائی جائے۔ ہمارے ہاں اس کے لیے حالات ساز گار نہیں ہیں۔ جبر سے آپ سارے لوگوں کو نماز پر لگا نہیں سکتے، بلکہ اس کا ایک الٹا رد عمل آئے گا، لیکن اصولی حکم تو موجود ہے۔ فرض کریں، کسی وقت تعلیم، تبلیغ، دعوت کے یہ سارے پہلو پائے جاتے ہوں اور واقعتاً ریاست ایسی ہو جو اسلامی شعائر پر قائم ہو تو وہ آج بھی اس پر مواخذہ کر سکتی ہے۔ کچھ لوگ مسلمانوں میں سے اگر نماز نہیں پڑھتے تو وہ جواب طلبی کر سکتی ہے۔

مطیع سید: نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیماری کے دوران میں حضرت ابو بکر کو نماز پڑھانے کے لیے کہا تو حضرت عائشہ نے کہا کہ وہ تو بڑے نرم دل کے آدمی ہیں، آپ حضرت عمر کو حکم

فرمادیں۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم صواحبِ یوسف ہو۔[8] اس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا مراد تھی؟

عمار ناصر: مراد یہ کہ میں کچھ اور چاہ رہا ہوں، لیکن تم اپنی مرضی چلانے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں چاہ رہا ہوں کہ لوگوں کو پتا چل جائے کہ میری جگہ ابو بکر ہی امامت کے لیے کھڑے ہوں گے، لیکن تم اپنی منطق چلا رہی ہو۔ یہ عتاب کا اور سرزنش کا جملہ ہے۔

مطیع سید: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنازے کے بارے میں فرمایا کہ چالیس مومن اگر کسی کی نماز جنازہ پڑھیں تو اس پر جنت واجب ہو جاتی ہے۔[9] دین کا مزاج تو یہ ہے کہ ایک آدمی جو عمل کرے گا، اسی بنیاد پر اس کی بخشش کی جائے گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کس پہلو سے ہے؟ کیا محض سو لوگ اکٹھے ہو جائیں، چاہے وہ نیک ہی ہوں تو اس سے بندے کی بخشش ہو جائے گی؟

عمار ناصر: ایک بات تو اس مضمون کی روایات میں یہ پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ کسی بھی عمل پر مغفرت کی جو بات کہی جاتی ہے، وہ اس اصولی شرط کے ساتھ مشروط ہوتی ہے کہ بخشش سے کوئی مانع اس کے عمل میں موجود نہ ہو۔ اگر کوئی مانع نہ ہو تو پھر یہ اللہ تعالیٰ کے اصول کے مطابق ہے۔ ایک آدمی کا کوئی اچھا عمل ہے، اس سے اس کے گناہوں کی مغفرت ہو جاتی ہے۔ اس طرح اس کی مجموعی زندگی اچھی ہے تو چاہے کچھ گناہ بھی ہوں، لیکن چالیس یا سو نیک مسلمان اس کے حق میں سفارش کریں تو اس کی بخشش کر دیا جانا اللہ کے اصول کے مطابق ہے۔ دوسرا یہ کہ اس سے اصل مقصود لوگوں کو ترغیب دینا ہے کہ وہ مسلمان کے جنازے میں شریک ہوا کریں۔

مطیع سید: یہ تو ہمیں تھوڑا غور کرنے سے سمجھ میں آیا کہ اس سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ ہے، جو دوسری احادیث سے معلوم ہوتی ہے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تو اس بات کا احساس ہو گا کہ لوگ میرے الفاظ کے ظاہری معنی بھی لے لیں گے۔

عمار ناصر: نہیں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جو حاضر باش صحابہ تھے، وہ باتوں کو صحیح تناظر میں سمجھتے تھے۔ اصل میں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم براہ راست جن سے خطاب کر رہے ہیں، ان کو

---

[8] ۔ کتاب اقامۃ الصلوٰۃ والسنۃ فیھا، باب ماجاء فی صلوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی مرضہ، رقم 1234۔

[9] ۔ کتاب الجنائز، باب ماجاء فیمن صلی علیہ جماعۃ من المسلمین، رقم 1490-1488۔

ذہن میں رکھ کر بات کہہ رہے ہیں۔ یہ ذہن میں رکھ کر تو بات نہیں کر رہے کہ میری یہ بات بعد میں کوئی سنے گا تو اس کا کیا مطلب لے گا۔ اصل میں جو مخاطب ہیں، ان کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام ہے تاکہ جنازے میں شریک ہونے کا رجحان بڑھے۔ اور یہ بات بھی اس میں ہے کہ یہ کوئی جھوٹی تسلی نہیں ہے۔ یہ اللہ کا اصول بھی ہے کہ آدمی کے مجموعی اعمال اگر ٹھیک ہیں، 'خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا'، کوئی بڑا گناہ ایسا نہیں ہے جو بخشش میں مانع ہو تو نیک لوگوں کے جنازہ پڑھنے سے، اللہ تعالیٰ ان کی سفارش کیوں نہیں قبول کریں گے؟

مطیع سید: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی جنازے کے ساتھ جاتے تو تب تک نہ بیٹھتے جب تک اسے قبر میں نہ اتار دیا جاتا۔ یہود کا ایک عالم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ہم بھی ایسے ہی کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر بیٹھ گئے اور فرمایا کہ یہود کے خلاف کیا کرو۔[10] یہاں کیا صرف تشخص کا مسئلہ بن رہا ہے؟ ورنہ ایک اچھی بات میں یہود کے مطابق عمل کرنا تو کوئی بری بات نہیں تھی۔ کیوں ایک اچھی بات کے بھی خلاف کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے؟

عمار ناصر: قیام للجنازہ کی روایتیں مختلف ہیں اور ان سے مختلف طرح کی تصویر بنتی ہے۔ اگر واقعہ ایسے ہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے رہتے تھے تو یہ ایک عام معمول کی بات تھی۔ ایسا نہیں کہ کھڑے رہنے کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا، بلکہ عام معمول میں جب تک میت قبر میں نہیں رکھ دی جاتی، آپ کھڑے رہتے ہوں گے۔ اس تناظر میں اگر یہودی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا ہو کہ ہم بھی یہی کرتے ہیں تو یہ معلوم ہے کہ یہودیوں کے ہاں ایسی چیزیں عام معمول میں نہیں ہوتی تھیں، وہ اسے ایک فقہی اور شرعی حکم بنا لیتے تھے۔ تو ایسی چیزیں جہاں یہ معلوم ہو کہ یہودیوں نے اس کو کوئی فقہی حکم بنا رکھا ہے، اور ان سے ہماری مشابہت ہو سکتی ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ ان کے خلاف کیا جائے۔ جیسے ڈاڑھیوں کو رنگنے یا نہ رنگنے کے معاملے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصولاً کوئی حکم نہیں دیا تھا، لیکن آپ کو پتا چلا کہ یہودی کہتے ہیں کہ ان کو نہیں رنگنا چاہیے تو فرمایا کہ ڈاڑھیوں کو رنگا کرو اور یہود کی مخالفت کرو۔ یہودی کہتے تھے کہ مسجد میں جوتا پہن کر نماز پڑھنا، یہ قطعاً نہیں ہونا چاہیے، یہ ممنوع ہے تو آپ

---

[10] ۔ کتاب الجنائز، باب ماجاء فی القیام للجنازۃ، رقم 1545۔

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جوتے پہن کے نماز پڑھا کرو اور ان کی مخالفت کرو۔

مطیع سید: یہ ایسے ہی ہے، جیسے حضرت مسیح علیہ السلام نے یہودی علما کی کچھ اس طرح کی پابندیوں کو توڑا تھا؟

عمار ناصر: جی ایسا ہی ہے۔

مطیع سید: ایک شخص مدینے میں ہی پیدا ہوا اور مدینے میں ہی فوت ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا جنازہ پڑھایا اور فرمایا: کاش، وہ کسی دوسرے ملک میں مرتا۔ کسی نے پوچھا کہ کیوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی آدمی اپنی پیدایش کی جگہ کے علاوہ دوسرے مقام پر مرتا ہے تو اس کی پیدایش کے مقام سے لے کر موت کے مقام تک اس کو جنت میں جگہ دی جاتی ہے۔[11] وطن سے دوری میں ایسی کیا بات ہے کہ اسے اجر میں بدل دیا جائے گا؟

عمار ناصر: اصل میں تو اصول یہ ہے کہ دنیا میں مومن کو جو بھی کوئی تکلیف یا کوئی محرومی ہوتی ہے تو اس کی تلافی ہوتی ہے۔ ایک آدمی اگر پردیس میں مرا ہے، جیسے غالب نے کہا ہے: مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور، تو اللہ تعالیٰ اس کی تلافی کریں گے۔

مطیع سید: ایک عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا کہ میری بیٹی کی شادی ہونے والی ہے اور چیچک کی وجہ سے اس کے سر کے بال جھڑ گئے ہیں تو کیا میں اس کے بالوں میں جوڑا لگا سکتی ہوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منع فرمایا اور فرمایا کہ اللہ کی لعنت ہو جوڑا لگانے والی پر اور اس پر جس نے جوڑا لگوایا ہو۔[12] یہاں باقاعدہ عذر موجود ہے کہ بیٹی دلہن بن رہی ہے اور یہ جوڑا لگانا بھی وقتی طور پر ہے، تو اس کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیوں ناپسند فرمایا؟

عمار ناصر: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن بالوں کا لگانا مقصود تھا، کوئی ایسی کیفیت تھی جس سے وہ بال اصلی معلوم ہوں۔ فقہا بھی یہی اخذ کرتے ہیں کہ اس طرح بالوں کے ساتھ بالوں کو جوڑنا کہ یہ بھی اصلی معلوم ہوں، یہ ایک طرح سے دھوکے میں آ جاتا ہے۔ غالباً آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی جو شکل تھی، وہ اسی طرح کی تھی، لیکن اس کے علاوہ جو دوسری چیزیں ہیں، جیسے

---

[11] ۔ کتاب الجنائز، باب ماجاء فیمن مات غریباً، رقم 1614۔

[12] ۔ کتاب النکاح، باب الواصلۃ والواشمۃ، رقم 1988۔

ہمارے ہاں پر اندے ہوتے ہیں یا بالوں کو لمبا کرنے والی اور چیزیں ہیں، ان میں چونکہ یہ پہلو نہیں ہے تو ان کی اجازت ہے۔

مطیع سید: اور اگر اس میں دھوکا نہ ہو، بلکہ دوسرے فریق کو بتا دیا جائے کہ اس طرح ہو گا؟

عمار ناصر: اس میں دو پہلو ہیں: ایک تو دھوکے کا پہلو ہے، وہ تو ہے ہی ناجائز۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس میں دھوکا نہ ہو اور دوسرے فریق کو معلوم بھی ہو تو بھی شریعت میں اس کو پسند نہیں کیا گیا کہ آپ اپنے مصنوعی بالوں کو اس طرح ظاہر کریں، جیسے وہ اصلی ہیں۔ جیسے ایک حدیث میں 'لابس ثوبی زور' کی تعبیر آتی ہے کہ انسان جھوٹ کے دو کپڑے پہن لیتا ہے۔[13] تو اس میں انسان کی جو ایک شخصیت جھلکتی ہے، اس پر بھی ایک تبصرہ ہے۔

مطیع سید: حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے طلاق دی اور پھر رجوع کر لیا۔[14] کیا یہ روایت درست ہے؟ کیونکہ ایک دوسری روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی ازواج سے علیحدگی کی بات آتی ہے۔ کیا یہ کوئی الگ واقعہ ہے؟

عمار ناصر: بعض روایات میں ذکر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حفصہ کو طلاق دی اور پھر رجوع کر لیا، لیکن اس کی کوئی تفصیل منقول نہیں کہ یہ کون سا موقع تھا یا اس کا سبب کیا تھا۔ ممکن ہے، ازواج سے علیحدگی اختیار کرنے کے واقعے کو ہی کسی راوی نے یوں بیان کر دیا ہو یا ممکن ہے، کسی اور وجہ سے آپ نے طلاق دی ہو۔ شارحین عموماً قیاس کرتے ہیں کہ سورۂ تحریم میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک راز فاش کرنے والی ایک زوجہ سیدہ حفصہ تھیں تو شاید اس موقع پر آپ نے طلاق دی ہو، لیکن اس واقعے میں تو دوسری زوجہ سیدہ عائشہ تھیں، ان کے متعلق ایسی کوئی بات منقول نہیں۔

[باقی]

---

[13]۔ ابو داؤد، رقم 4997۔

[14]۔ کتاب الطلاق، رقم 2016۔

گفتگو: محمد حسن الیاس

ترتیب و تدوین: شاہد رضا

دین میں ڈاڑھی کا تصور

(2)

[ڈاڑھی کے حوالے سے "23 اعتراضات سیریز" کے ایک پروگرام کا خلاصہ جناب محمد حسن الیاس صاحب نے بیان کیا ہے۔ زیر نظر تحریر انھی کی گفتگو سے اخذ و استفادہ پر مبنی ہے۔]

غامدی صاحب کے موقف پر اعتراضات کا جائزہ

غامدی صاحب کی اس رائے سے علماے کرام متفق نہیں ہیں۔ ان کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے علما بنیادی طور پر تین اعتراضات پیش کرتے ہیں، جن کی روشنی میں وہ غامدی صاحب کے موقف کو قابل قبول نہیں سمجھتے:

پہلا اعتراض

علماے کرام پہلا اعتراض یہ پیش کرتے ہیں کہ غامدی صاحب کا یہ دعویٰ کہ قرآن و سنت میں ڈاڑھی رکھنے کی کوئی ہدایت سرے سے موجود نہیں ہے، یہ خلاف حقیقت ہے، اس لیے کہ سورۂ روم کی آیت 30 تا 32 میں ایک ایسی ہدایت موجود ہے جس سے ہم یہ حکم اخذ کر سکتے ہیں کہ ڈاڑھی رکھنا لازم ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ "سو ایک خدا کے ہو کر تم (اپنے باپ

اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ.(الروم30:30)

ابراہیم کی طرح اب) اپنا رخ اُس کے دین کی طرف کیے رہو۔ تم اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کی پیروی کرو، (اے پیغمبر)، جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی اِس فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔''

اس آیت کو پیش کر کے علماے کرام یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس میں یہ کہا گیا ہے کہ اللہ نے جس فطرت پر تمھیں پیدا کیا ہے، اس کی پیروی کرنی ہے اور فطرت کو تبدیل نہیں کرنا۔ چونکہ ڈاڑھی انسانی جسم پر فطرتاً نمودار ہوتی ہے، اس لیے اگر انسان ڈاڑھی کاٹتا ہے تو گویا وہ اللہ کی تخلیق اور اس کی بنائی ہوئی فطرت کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید بالواسطہ (indirect) ہی سہی، لیکن انسان کو ڈاڑھی رکھنے کی ہدایت کرتا ہے، اس لیے کہ ڈاڑھی فطرت ہے اور فطرت کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ مزید برآں، ڈاڑھی کو کاٹنا در حقیقت فطرت کو مسخ کرنا ہے۔

غامدی صاحب نے اس اعتراض کا جواب یہ دیا ہے کہ اگر ہم اس آیت کا سیاق و سباق (context) دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت جسمانی شکل و صورت میں تبدیلی کی بات ہی نہیں کر رہی، بلکہ یہاں توحید کا ایک تصور زیر بحث ہے۔ اس میں توحید اور شرک کے پس منظر میں یہ بات ہو رہی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت لوگ شرک کے گناہ میں مبتلا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں شرک کی مذمت کی گئی ہے اور توحید کی طرف بلایا گیا ہے۔ اس آیت میں بھی یہی بات کہی گئی ہے کہ شرک انسان کی فطرت کے مطابق نہیں ہے، جب کہ توحید انسان کی فطرت کا حصہ ہے۔ چنانچہ اس آیت کے سیاق و سباق سے واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید لوگوں پر یہ زور دے رہا ہے کہ توحید وہ چیز ہے جو آپ کے اندر فطری طور پر موجود ہے، اور جب آپ توحید کو ترک کر کے شرک کو اختیار کرتے ہیں تو گویا آپ فطرت کے ان حاصلات (achievements) اور رہنمائی کی مخالفت کرتے ہیں۔ چنانچہ اس آیت کے سیاق و سباق کو مد نظر رکھتے ہوئے پڑھیں تو یہ خود بتاتی ہے کہ اس میں توحید زیر بحث ہے۔ چنانچہ ارشاد فرمایا:

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّیْنِ حَنِیْفًا فِطْرَتَ

''سو ایک خدا کے ہو کر تم (اپنے باپ

اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ. مُنِیْبِیْنَ اِلَیْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ. مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ.

(الروم30:30-32)

ابراہیم کی طرح اب) اپنا رخ اُس کے دین کی طرف کیے رہو۔ تم اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کی پیروی کرو، (اے پیغمبر)، جس پر اُس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی بنائی ہوئی اِس فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔ (اِس کی پیروی کرو)، تم سب اللہ کی طرف متوجہ ہو کر اور اُس سے ڈرتے رہو اور نماز کا اہتمام رکھو اور مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ۔ اُن مشرکین میں سے جنھوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور گروہوں میں بٹ گئے ہیں۔ ہر گروہ اُسی میں مگن ہے جو اُس کے اپنے پاس ہے۔“

اس آیت سے یہ بات بالبداہت واضح ہے کہ اس میں توحید کی دعوت اور شرک کی مذمت بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ اس آیت سے جو استدلال (argument) کیا جاتا ہے کہ ڈاڑھی بھی جسم پر نکل آتی ہے اور ڈاڑھی کو کاٹنا فطرت کی تبدیلی ہے اور قرآن مجید اسی کی ممانعت کر رہا ہے تو اس آیت میں ڈاڑھی سے متعلق سرے سے کوئی چیز زیر بحث ہی نہیں ہے۔

دوسرا اعتراض

دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ غامدی صاحب جو نقطۂ نظر پیش کر رہے ہیں، بعض احادیث اس کی تردید کرتی ہیں۔ چنانچہ اگر ہم غامدی صاحب کی یہ بات مان لیں کہ ڈاڑھی کا حکم دین میں نہیں ہے تو پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ان احادیث کا کیا کیا جائے گا جو اس سے مختلف بات بیان کر رہی ہیں۔ اپنے موقف کے لیے وہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ انسانی فطرت کی دس چیزیں ہیں اور ان دس چیزوں میں ڈاڑھی رکھنا بھی شامل ہے۔ وہ کہتے

ہیں کہ جب ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دوسری روایت میں فطرت میں شامل چیزوں کے حوالے سے ڈاڑھی کے بارے میں یہ رہنمائی مل گئی ہے تو اب ہمیں قرآن مجید کے اندر جو فطرت کی تبدیلی کی بات کی گئی ہے، اس کو بھی اسی حدیث کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ مزید برآں، خود روایت ہمیں بتا رہی ہے کہ ڈاڑھی رکھنا تو فطرت کا حصہ ہے اور انسانی فطرت میں جو دس چیزیں شامل ہیں، اس میں ڈاڑھی بھی ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم کی روایت ہے:

عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: عَشْرٌ مِنَ الْفِطْرَةِ: قَصُّ الشَّارِبِ وَإِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ وَالسِّوَاكُ وَاسْتِنْشَاقُ الْمَاءِ وَقَصُّ الأَظْفَارِ وَغَسْلُ الْبَرَاجِمِ وَنَتْفُ الإِبْطِ وَحَلْقُ الْعَانَةِ وَانْتِقَاصُ الْمَاءِ. قَالَ زَكَرِيَّاءُ: قَالَ مُصْعَبٌ: وَنَسِيتُ الْعَاشِرَةَ إِلاَّ أَنْ تَكُونَ الْمَضْمَضَةَ. زَادَ قُتَيْبَةُ قَالَ وَكِيعٌ: انْتِقَاصُ الْمَاءِ، يَعْنِي الاِسْتِنْجَاءَ. (رقم 627)

”ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دس باتیں فطرت میں سے ہیں: مونچھیں کاٹنا، ڈاڑھی بڑھانا، مسواک کرنا، ناک میں پانی چڑھانا، ناخن تراشنا، انگلیوں کے جوڑوں کو دھونا، بغل کے بال صاف کرنا، زیر ناف بال صاف کرنا اور پانی سے استنجا کرنا“۔ راوی کہتے ہیں کہ میں دسویں چیز بھول گیا، شاید کلی کرنا ہو۔ وکیع جو کہ اس حدیث کے راویوں میں سے ہیں، کہتے ہیں کہ ’انتقاص الماء‘ کا مطلب ہے: پانی سے استنجا کرنا۔“

آیئے، اب دیکھتے ہیں کہ اس حدیث سے علما کا وہ مقدمہ ثابت ہوتا ہے جو وہ عام طور پر ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ اس روایت کے بارے میں خود بڑے بڑے محدثین نے بعض بہت اہم سوالات اٹھائے ہیں اور اسے قبول نہیں کیا ہے۔ اس حدیث کے بارے میں امام ابن عبد البر رحمہ اللہ اور دیگر علما نے سخت تنقید کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے۔ اس حدیث کے راوی (narrator) معتبر نہیں ہیں۔ مزید یہ کہ راوی یہاں دسویں چیز کو یاد نہیں کر پایا، اس وجہ سے یہ بات قابل اعتبار نہیں ہے کہ جو باقی چیزیں اس نے بیان کی ہیں، وہ بھی اسے مستحضر ہوں۔ اس کے برعکس، علما یہ کہتے ہیں کہ

ایک دوسری حدیث میں انسانی فطرت کے بارے میں پانچ چیزیں بیان کی گئی ہیں، ان میں ڈاڑھی شامل نہیں ہے۔ یہ حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے اور بخاری جیسی ایک بڑی عظیم کتاب میں بھی حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کی گئی ہے۔[1] چنانچہ صحیح مسلم کی روایت ہے:

عَنْ أَبِی هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ صلی اللّٰہُ علیہ وسلم قَالَ: اَلْفِطْرَةُ خَمْسٌ -أَوْ خَمْسٌ مِنَ الْفِطْرَةِ- اَلْخِتَانُ وَالِاسْتِحْدَادُ وَتَقْلِیمُ الاَظْفَارِ وَنَتْفُ الإِبْطِ وَقَصُّ الشَّارِبِ. (رقم 620)

”حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پانچ چیزیں فطرت میں سے ہیں: ختنہ کرانا، زیر ناف بال صاف کرنا، ناخن تراشنا، بغلوں کے بال صاف کرنا اور مونچھیں تراشنا۔“

اس حدیث میں ڈاڑھی رکھنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ اب اس کے مقابل میں ایک ایسی روایت جس کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس درجے میں متحقق نہیں ہے اور ابن عبد البر جیسے بڑے علما کے نزدیک اس کے راوی معتبر نہیں ہیں، یہ کیسے مانا جا سکتا ہے کہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈاڑھی رکھنا فطرت قرار دیا ہے، جب کہ ایک دوسری روایت اس کے ساتھ موجود ہے، جس کو بڑی بڑی کتابوں میں نقل کیا جا رہا ہے اور اس میں ڈاڑھی کا سرے سے ذکر تک نہیں ہے۔

تیسرا اعتراض

تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ڈاڑھی کے متعلق جو روایتیں غامدی صاحب نے قبول کی ہیں یا ان کی شرح و وضاحت کی ہے یا ان کے سیاق و سباق کے بارے میں بات کی ہے، انھی روایتوں کے اندر جو الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے نقل ہوئے ہیں، ان میں امر کا صیغہ (verb to order) ہے، یعنی جو فعل (verb) آیا ہے، وہ حکم دینے کے معنی میں استعمال ہوتا

[1]۔ صحیح بخاری، رقم 5890۔

ہے، اس لیے کہ امر عربی زبان میں اصلاً وجوب (compulsory things) کے لیے آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جملے میں جب بھی کوئی فعل امر آئے گا، وہ کسی چیز کو لازم ٹھیرانے یا واجب ٹھیرانے کے لیے آئے گا۔ ان روایات کے الفاظ 'واعفوا اللحیٰ' اور 'قصوا الشوارب' میں چونکہ امر کا فعل استعمال ہوا ہے، اس لیے اس سے علما نے یہ مراد لی ہے کہ لازماً ڈاڑھیاں بڑھاؤ اور مونچھیں پست کرو، گویا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک حکم (order) ہے۔

غامدی صاحب یہ کہتے ہیں کہ یہ دعویٰ ہی درست نہیں ہے کہ امر کا صیغہ اصلاً وجوب کے لیے آتا ہے۔ امر کا صیغہ وجوب کے لیے بھی آتا ہے، استحباب کے لیے بھی آتا ہے، اباحت کے لیے بھی آتا ہے اور اس سے مختلف دیگر معانی میں بھی آتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ خود کئی جگہوں پر امر کا صیغہ استعمال کر رہے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ. "اللہ کی اِس روزی سے کھاؤ اور پیو۔"

(البقرہ 2:60)

اس آیت کو پڑھنے والا دنیا میں کوئی بھی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ تعالیٰ اس میں 'كُلُوْا وَاشْرَبُوْا' فعل استعمال کر کے کسی چیز کو لازم ٹھیرا رہے ہیں۔ ہر آدمی یہ جانتا ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو یہ حکم نہیں دے رہے کہ ہم لازماً کھائیں اور پئیں۔ سب یہی کہتے ہیں کہ یہاں پر امر وجوب کے لیے نہیں، بلکہ اباحت (permission) کے لیے ہے۔ لہٰذا ہمیشہ جملہ یا سیاق و سباق یہ طے کرتا ہے کہ اس میں فعل امر کس معنی میں آیا ہے۔ چنانچہ اب ہم اس روایت کو دیکھتے ہیں جس میں ڈاڑھی کے متعلق الفاظ آئے ہیں۔ آپ لوگ یہ دیکھ لیں گے کہ جو چیزیں اس میں زیر بحث ہیں، کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو لازم کر رہے ہیں؟ چنانچہ حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ:

خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى مَشْيَخَةٍ مِنَ الْاَنْصَارِ بِيضٌ لِحَاهُمْ، فَقَالَ: يَا مَعْشَرَ الْاَنْصَارِ، حَمِّرُوْا وَصَفِّرُوْا، وَخَالِفُوْا أَهْلَ الْكِتَابِ. قَالَ: فَقُلْنَا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، إِنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصار کے کچھ بڑے بوڑھوں کی مجلس میں، جن کی ڈاڑھیاں سفید ہو چکی تھیں، تشریف لائے تو اُن سے کہا: انصار کے لوگو، اپنی ڈاڑھیوں کو سرخ یا زرد کر لیا

يَتَسَرْوَلُوْنَ، وَلَا يَأْتَزِرُوْنَ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: تَسَرْوَلُوْا، وَائْتَزِرُوْا، وَخَالِفُوْا أَهْلَ الْكِتَابِ. قَالَ: فَقُلْنَا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، إِنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ يَتَخَفَّفُوْنَ، وَلَا يَنْتَعِلُوْنَ. قَالَ: فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: فَتَخَفَّفُوْا، وَانْتَعِلُوْا، وَخَالِفُوْا أَهْلَ الْكِتَابِ. قَالَ: فَقُلْنَا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ، إِنَّ أَهْلَ الْكِتَابِ يَقُصُّوْنَ عَثَانِيْنَهُمْ، وَيُوَفِّرُوْنَ سِبَالَهُمْ. قَالَ: فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: قُصُّوْا سِبَالَكُمْ، وَوَفِّرُوْا عَثَانِيْنَكُمْ، وَخَالِفُوْا أَهْلَ الْكِتَابِ.

(مسند احمد، رقم 22283)

کرو اور اِس معاملے میں اہل کتاب کی مخالفت کرو۔ ابو امامہ کہتے ہیں کہ اِس پر ہم نے سوال کیا: یارسول اللہ، (پھر اِس کا کیا حکم ہے کہ) اہل کتاب شلوار پہنتے ہیں، وہ لنگی (تہ بند) نہیں باندھتے؟ آپ نے فرمایا: تم شلوار بھی پہنو اور لنگی بھی باندھو اور اِس معاملے میں بھی اُن کی مخالفت کرو۔ ہم نے پھر سوال کیا: (اور اِس کا کہ) اہل کتاب موزے پہنتے ہیں، وہ جوتے نہیں پہنتے؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم موزے بھی پہنو اور جوتے بھی اور اِس معاملے میں بھی اہل کتاب کی مخالفت کرو۔ ہم نے سوال کیا: یارسول اللہ، (اور اِس کا کہ) اہل کتاب ڈاڑھی کتراتے اور مونچھیں خوب بڑھاتے ہیں؟ ابو امامہ کہتے ہیں کہ اِس پر بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم مونچھیں تراشا کرو اور ڈاڑھیوں کو خوب بڑھنے دو، (جس طرح وہ مونچھوں کو بڑھنے دیتے ہیں) اور اِس معاملے میں بھی اہل کتاب کی مخالفت کرو۔''

غامدی صاحب نے 'حَمِّرُوْا وَصَفِّرُوْا' کا ترجمہ کیا ہے: ''اپنی ڈاڑھیوں کو سرخ یا زرد کر لیا کرو''، یہ ترجمہ نہیں کیا کہ ''اپنی ڈاڑھیوں کو لازماً زرد یا سرخ کرو''۔ اگر اس روایت میں آپ ڈاڑھی کے بارے میں فعل امر کو وجوب کے لیے مانتے ہیں تو بعینہٖ فعل امر کو اوپر مذکور باقی چار چیزوں کے

لیے بھی وجوب کے لیے ماننا پڑے گا، یعنی ہمیں یہ بھی کہنا پڑے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شلوار پہننے، تہ بند پہننے، موزے پہننے اور جوتے پہننے کو بھی لازم قرار دیا ہے۔ جس طرح موزے اور جوتے پہن کر نماز پڑھنے کو لازم قرار دیا ہے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈاڑھیوں کو بھی رنگنا لازم قرار دیا ہے۔

چنانچہ ہر شخص جانتا ہے کہ اس حدیث کا سیاق وسباق یہ بتا رہا ہے کہ سوال کرنے والے نے پوچھا ہے کہ دوسرے لوگ یہ کام نہیں کرنے دیتے، بلکہ وہ یہ دینی لحاظ سے سمجھتے ہیں کہ یہ جائز نہیں ہے۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں پر جو امر کا صیغہ استعمال کیا ہے، وہ اباحت کے لیے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمھارے لیے یہ کام کرنا جائز ہے۔ تم کرنا چاہو تو یہ کام کر سکتے ہو۔ اس میں اہل کتاب کی مخالفت کرو۔

خلاصۂ کلام

اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ غامدی صاحب ڈاڑھی رکھنے کو اسلام کا کوئی حکم نہیں سمجھتے، کیونکہ دین سے ایسا کوئی حکم ثابت نہیں ہے۔ نہ قرآن مجید میں اس کا کوئی ذکر ہے اور نہ سنت میں۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے، تو وہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ذکر ہدایت یا حکم کے طور پر نہیں، بلکہ دو صورتوں میں کیا ہے: ایک متکبرانہ (arrogant) طریقے پر مونچھیں بڑی اور ڈاڑھی چھوٹی رکھنے والوں پر ناپسندی کا تبصرہ کیا ہے اور دوسری صورت میں بدعات (religious innovations) کی مخالفت کی ہے۔ یہاں یہ بات پیش نظر رہے کہ ان احادیث سے ہٹ کر دین کی جو ایک مستقل روایت سنت ہے، اس میں اللہ کے پیغمبر نے مونچھوں کو پست رکھنے یا تراشنے کا ایک الگ سے حکم جاری فرمایا ہے، جو ان روایات میں زیر بحث نہیں ہے۔ اس حوالے سے غامدی صاحب کی کتاب ”میزان“ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

نعیم احمد بلوچ

حیاتِ امین

(سوانح مولانا امین احسن اصلاحی)

(18)

[صاحب ''تدبر قرآن'' کی وصیت کے مطابق
ان کے سوانح نگار نعیم احمد بلوچ کے قلم سے]

تقسیم ہند اور مولانا اصلاحی

مولانا اصلاحی تقسیم ہند کے موقع پر کیا موقف رکھتے تھے، اس حوالے سے ہم ان کی ادارت میں شائع ہونے والے جریدے ''الاصلاح'' کے اقتباسات پچھلے صفحات میں بیان کر چکے ہیں۔ یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ وہ مسلم لیگ کے اس بیانیے سے اختلاف رکھتے تھے کہ قومیت کی بنیاد پر چلنے والی مسلم لیگ کی تحریک کا اسلام سے کوئی تعلق ہے۔ اس حوالے سے انھوں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی پر بھی تنقید کی اور آخر انھوں نے مولانا اصلاحی کے موقف کو تسلیم کر لیا۔ اس ہم آہنگی کے بعد ہی وہ جماعت اسلامی میں شامل ہوئے۔

جنگ عظیم دوم کے بعد (1945ء) میں جب برطانیہ نے ہندستان چھوڑ دینے کا عندیہ دیا تو

پورے ملک میں ہر طرف یہ سوال زیر بحث آگیا کہ ہندستان تقسیم ہو یا متحد رہے؟ اس بابت مولانا اصلاحی کیا موقف رکھتے تھے؟ اس حوالے سے انھوں نے فروری 1946ء کے ''ترجمان القرآن'' کے شمارے میں ایک تفصیلی مضمون لکھا، جو ''اشارات'' کے عنوان سے بہ طور اداریہ شائع ہوا تھا۔ اس تفصیلی مضمون کا خلاصہ انھوں نے آخر میں یہ بیان کیا:

''الف: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تمام دنیا میں تبلیغِ دین کی جو ذمہ داری ڈالی گئی تھی، اس کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رہنمائی فرما کر اللہ کی طرف سے اس کی تکمیل کا کام اپنی امت کے سپرد فرمایا تاکہ یہ امت ہر ملک، ہر قوم اور ہر زبان میں قیامت تک اس دین کی تبلیغ کرتی رہے۔

ب: اس تبلیغ کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ شرط ہے کہ دل سے کی جائے، زبان سے کی جائے، عمل سے کی جائے، بلا تقسیم و تفریق پورے دین کی کی جائے، بے خوف اور بلا لومتِ لائم اور بے رورعایت کی جائے اور اگر ضرورت آئے تو جان دے کر کی جائے۔

ج۔ اس جماعتی فرض کی ادائیگی کا باضابطہ ادارہ خلافت کا ادارہ تھا اور جب تک یہ ادارہ موجود تھا، ہر مسلمان اس فرض کی ذمہ داریوں سے سبک دوش تھا۔

د۔ اس ادارے کے منتشر ہو جانے کے بعد اس فرض کی ذمہ داری امت کے تمام افراد پر ان کے درجہ اور استعداد کے لحاظ سے تقسیم ہو گئی۔

ہ۔ اب اس فرض کی مسئولیت اور ذمہ داری سے سبک دوش ہونے کے لیے دو ہی راہیں مسلمانوں کے لیے باقی رہ گئی ہیں: اس ادارے کو قائم کریں یا کم از کم اس کو قائم کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائیں۔

و۔ اگر مسلمان ان میں سے کوئی بات بھی نہ کریں تو وہ اس فرضِ رسالت کو ادا کرنے کے مجرم ہوں گے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے سپرد کیا گیا ہے اور صرف اپنی ہی غلط کاریوں کا وبال اپنے سر نہیں لیں گے، بلکہ خلق کی گم راہی کا وبال بھی ان کے سر آئے گا۔''

اسی بات کو مولانا اصلاحی نے دوسری جگہ یوں بیان کیا ہے:

''اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ جو لوگ دعوت دین کی تجدید کے لیے اٹھیں گے، وہ اگرچہ ہر اس بات کو جو کفر و شرک ہے، کفر و شرک ہی کہیں گے اور لوگوں کے اعمال و عقائد

میں جہاں اس کا کوئی شائبہ موجود ہو گا، بے دھڑک اس کی نشان دہی بھی کریں گے، لیکن اس کے باوجود نہ ان کو کافر و مشرک سمجھیں گے، نہ کافر و مشرک کہیں گے اور نہ کافر و مشرک قرار دے کر ان سے براءت کا اظہار کریں گے۔ یہ تبلیغ اور دعوت کا دور ہے، جس کا اصل کام یہ ہے کہ لوگوں میں کفر و ایمان کا امتیاز پیدا ہو۔ جب یہ امتیاز پیدا ہو جائے یا وہ شرائط پوری ہو جائیں جو یہ امتیاز پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے، تب وہ وقت آتا ہے کہ ان لوگوں کے کفر کا فیصلہ کیا جائے جو اپنے کفر پر اڑے ہوئے ہیں۔'' (اشارات، مارچ 1946ء، 10)

چنانچہ ان کے نزدیک خلافت کے قیام کی دعوت مسلمانوں کو بھی دینی چاہیے تھی اور غیر مسلم کو بھی۔ ان کے نزدیک مسلم ہندو کی بحث فضول تھی اور پاکستان کے قیام کا مطالبہ بھی مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا۔ البتہ، جب انگریزی حکومت نے تین جون 1947ء کو تقسیم کے فیصلے کا اعلان کر دیا تو جماعت اسلامی نے اس کی مخالفت نہیں کی، البتہ اپنے موقف کو مسلم لیگ کی قیادت تک پہنچانے کے لیے جماعت اسلامی کے اُس وقت کے سیکرٹری قمر الدین خان، مولانا مودودی کے ایما پر محمد علی جناح سے دہلی میں ان کی قیام گاہ ''گلِ رعنا'' میں جا کر ملے اور ان کے سامنے جماعت اسلامی کے قیام کے مقاصد بیان کیے۔ انھوں نے واضح کیا کہ اگر پاکستان کو نیک اور اہل قیادت نہ ملی تو اس آزادی کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔

محمد علی جناح نے پورے تحمل سے 45 منٹ تک ان کی بات سنی۔ اور اس کے جواب میں کہا کہ وہ مولانا مودودی کی دینی خدمات کو نہایت پسند کرتے ہیں۔ البتہ، اس وقت برصغیر کے مسلمانوں کو ایک آزاد ریاست کے حصول کی ضرورت ہے، ورنہ ان کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا اور وہ انگریزوں کے بعد ہندو اکثریت کے غلام بن جائیں گے۔ چنانچہ پاکستان ناگزیر ہے اور یہ کام کردار کی تطہیر سے بھی زیادہ اہم اور فوری نوعیت کا حامل ہے۔ انھوں نے یقین دلایا کہ اصل میں جماعت اسلامی اور مسلم لیگ میں کوئی اختلاف نہیں۔ جماعت جس اعلیٰ مقصد کے لیے کام کر رہی ہے، مسلم لیگ اس کام کے فوری حل کے لیے جدوجہد کر رہی ہے۔ اگر یہ کام اس وقت نہ ہوا تو جماعت کا کام بھی مکمل نہ ہو سکے گا۔

کہا جا سکتا ہے کہ جناح نے ایک طرف جماعت اسلامی کی تطہیرِ افکار اور تعمیرِ کردار کے کام کی تائید کی اور دوسری طرف قیام پاکستان کے بعد اس کام کو آگے بڑھانے کی طرف اشارہ کیا۔ یہ

ایک ماہر سیاست دان کی تدبیر تھی، جس پر جماعت کے رہنما خاموش ہو گئے۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ جماعت اسلامی نے قیام پاکستان کی خاموش حمایت کی۔

یہی وجہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد جماعت اسلامی نے بھی اپنے دو حصے کیے۔ مرکزی حصے نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے جماعت کے نظم کی پابندی کی اور ان کی رائے بھی یہی تھی کہ جماعت اسلامی کو اپنی جدوجہد کا محور اب پاکستان ہی کو بنانا چاہیے۔

فسادات پر نقطۂ نظر

قیام پاکستان سے پہلے اور بعد میں جب ہندستان کے بعض حصے شدید فسادات کا شکار ہوئے تو مسلم لیگ اور دوسری سیاسی و مذہبی جماعتیں اپنے اپنے فرقوں اور جمعیتوں کی حمایت میں کھڑی ہوئیں تو جماعت اسلامی کے پلیٹ فارم سے مولانا اصلاحی نے ایک بالکل مختلف بات کی۔ وہ ''اشارات'' کے عنوان سے لکھتے ہیں:

> ''قوموں کی یہ عجیب فطرت ہے کہ جب ان پر کوئی تباہی آتی ہے تو ہمیشہ اس کے اسباب اپنے اندر تلاش کرنے کے بجاے دوسروں کے اندر ڈھونڈنے کی کوشش کرتی ہیں حالاں کہ اس کے اسباب خود ان کے اندر موجود ہوتے ہیں... قوموں کی اس غلطی کی دو کھلی وجہیں ہیں۔
>
> پہلی وجہ یہ ہے کہ ان کا قومی غرور اس امر کے اقرار میں مانع ہوتا ہے کہ ان پر جو تباہی آئی ہے، وہ خود ان کی کسی مذہبی اور اخلاقی کم زوری کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔ اس چیز کا اگر وہ اعتراف کر لیں تو اس پر اصلاحِ احوال کی ایک بہت بڑی ذمہ داری آجاتی ہے، لیکن اس سے ان کے غرورِ نفس اور احساسِ برتری کو بڑی چوٹ لگتی ہے۔ اس وجہ سے وہ اصل حقیقت کی طرف توجہ کرنے کے بجاے کوشش اس بات کی کرتی ہیں کہ یا تو اس کو ایک اتفاقی حادثہ قرار دے کر گزر جائیں یا اس کا سارا الزام ظلم و زیادتی کرنے والے پر تھوپ کر اپنے آپ کو بھی مظلوم سمجھ لیں۔
>
> دوسری چیز جو ہمارے ارکان کو پیشِ نظر رکھنی ہے، وہ یہ ہے کہ حالات قومی تعصب کو کتنے ہی بھڑکانے والے ہوں، لیکن ہمیں بہر حال قومی تعصبات سے بالاتر رہ کر حق کی دعوت دینی ہے اور اسی پر عمل کرنا ہے۔ ہم جن اصولوں کو لے کر اٹھے ہیں، ان کو کسی قوم کی نفرت اور عداوت کی وجہ سے نہیں بدل سکتے۔...

جو لوگ متحدہ قومیت کا پرچار کر رہے تھے اور اسی میں ہندوستان کی نجات سمجھتے تھے، ان فسادات کے واقعات کے بعد اس قدر بوکھلا گئے ہیں کہ انھوں نے بہار میں نہ صرف مسلمانوں کو، بلکہ اپنے اس محبوب اصول کو بھی ذبح کر ڈالا۔ عدم تشدد، عدم تشدد کی پکار سے جن لوگوں کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے اور جن کا دعویٰ تھا کہ دنیا میں نجات ہے تو اسی عقیدے میں ہے، اب وہ قومی تعصب میں، جنون میں برملا ''تشدد'' کی آواز کہنے لگے ہیں۔ لیکن ہمارے لیے یہ بات جائز نہیں ہو گی کہ ہم اس طرح جذبات سے مغلوب ہو کر حق اور عدل کی راہ سے ہٹ جائیں۔ بہار اور دوسرے مقامات میں جو کچھ ہوا ہے، وہ کتنا ہی شرم ناک اور وحشیانہ ہو، لیکن اسلام نے ہم کو یہی تعلیم دی ہے کہ ہم زید کی غلطی کا بدلہ بکر سے نہیں لے سکتے۔ اگر خدانخواستہ کسی جگہ اس طرح کے حالات پیش آجائیں جیسے کہ ''نواکھلی'' میں پیش آئے ہیں اور ہمارا وہاں پر ایک رکن بھی موجود ہو تو اس کا فرض ہے کہ وہ پوری قوت سے مسلمانوں کو اس طرح کی زیادتی سے روکے اور مظلوم فریق کی مدد کرے اور اس راہ میں اس کی جان بھی چلی جائے تو اس کی پروانہ کرے۔ زیادتی کرنے والے مسلمان کو زیادتی کرنے سے روکنا نہ صرف اس فریق کی مدد ہے جس پر زیادتی ہو رہی ہے، بلکہ یہ زیادتی کرنے والے مسلمان کی مدد ہے، جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔'' (اشارات، دسمبر 1946ء)

مولانا اصلاحی کا یہ موقف صرف انھی کا موقف نہ تھا، بلکہ یہ پوری جماعت اسلامی کی رائے تھی۔ یہ اسلام کے اصولوں کے عین مطابق تھی۔ جماعت اسلامی نے اس پُر آشوب حالات میں ایسی عمدہ مثال پیش کی جس کی جتنی بھی توصیف کی جائے، کم ہے۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد ان اصولوں کی برملا خلاف ورزی کی گئی اور اس کی طرف مولانا اصلاحی نے زور دار طریقے سے توجہ دلائی۔ اس کا ذکر آگے کے صفحات میں آئے گا۔

مہاجر کیمپ اور مولانا اصلاحی

پاکستان بننے کے بعد جب پنجاب اور بنگال میں فسادات پھوٹ پڑے تو اس موقع پر جماعت اسلامی نے مذہب و قوم سے بالاتر ہو کر مظلومین کی حمایت اور عملی مدد کی۔

جماعت اسلامی نے مصیبت زدگان کی امداد کے لیے پٹنہ (بنگال) میں ریلیف کیمپ قائم کیا۔

یہ امدادی کیمپ مولانا امین احسن اصلاحی اور جناب عبدالجبار غازی کی سرکردگی میں قائم کیا گیا تھا۔ کیمپ کئی ماہ تک وہاں مظلوم مہاجرینِ فسادات کے لیے کام کرتا رہا۔

جماعت اسلامی کا مرکز پٹھان کوٹ میں تھا۔ یہ علاقہ ضلع گورداس پور میں شامل تھا۔ اس کے بارے میں زیادہ امکان یہی تھا کہ یہ پاکستان میں شامل ہو گا، لیکن آخری وقت میں اسے ہندستان میں شامل کر دیا گیا۔ اور یہ سارا علاقہ شدید فسادات کی لپیٹ میں تھا۔ چنانچہ اس فیصلے نے جماعت اسلامی سمیت علاقے کے تمام مسلمانوں کی زندگیوں کو خطرے میں ڈال دیا۔

یاد رہے کہ یہاں پر جماعت اسلامی کی مرکزی قیادت اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ موجود تھی۔ جماعت کی لائبریری اور سارا ساز و سامان بھی یہیں تھا۔

اس نازک موقع پر مولانا مودودی، مولانا اصلاحی اور جماعت اسلامی کے دوسرے رہنماؤں نے شان دار کردار پیش کیا۔ ان کی بہادری، جرأت اور ذہانت سے بیسیوں مسلمانوں کی جانیں اور عزتیں فسادیوں سے محفوظ رہیں۔

مولانا سید ابو الاعلیٰ صاحب کی صاحب زادی سیدہ حمیرا مودودی اپنی یادداشتوں کی کتاب ''شجرہائے سایہ دار'' میں دارالاسلام میں اگست 1947ء کے واقعات کے بارے میں لکھتی ہیں:

> ''یہ اگست 1947ء کے وہ دن تھے جب فرقہ وارانہ فسادات عروج پر تھے۔ ابا جان اور دارالاسلام کے کارکنوں کا رعب و دبدبہ اس قدر تھا کہ آس پاس کے ہندوؤں اور سکھوں کو جرأت نہیں ہوئی کہ وہ دارالاسلام کی حدود میں قدم بھی رکھیں۔ یہی وجہ تھی کہ مضافات کے دیہات سے لوگ اپنے اپنے گھر بار چھوڑ کر اپنے بیوی بچوں اور مویشیوں کے ساتھ دارالاسلام میں پناہ لینے کے لیے آ گئے تھے۔ پورا علاقہ مسلمانوں سے پٹا پڑا تھا۔ متاثرین کی آمد کا اتنا دباؤ تھا، لیکن اُس وقت فوج کی ہم راہی میں صرف تین بسیں لوگوں کو لینے کے لیے آئیں۔ ان میں سے بھی ایک بس چودھری نیاز علی خان صاحب کے گھر والوں کو لینے کے لیے بھیج دی گئی۔ اب صرف دو بسیں دارالاسلام والوں اور وہاں پہنچنے والے پناہ گزینوں کے لیے رہ گئیں۔
>
> ابا جان نے فوری طور پر فیصلہ کیا: ''اس وقت صرف عورتیں اور بچے ان دو بسوں میں چلے جائیں، مرد بعد میں جائیں گے''۔ غضب یہ ہوا کہ جو فوجی جوان بسوں کے ساتھ آئے تھے، انھوں نے حکم صادر کیا: ''دس منٹ کے اندر اندر آپ لوگ بسوں میں بیٹھ جائیں، ہمارے پاس

وقت بہت کم ہے۔'' اس وقت دادی اماں اور اماں جان نے کہا: ''ہم مردوں کے بغیر اکیلے کیسے جائیں، جب کہ قدم قدم پر سکھ کرپانیں لیے کھڑے ہیں!'' تقریباً یہی سوال ہر گھر میں اٹھا ہوا تھا اور چونکہ ہمارا گھر نمونے کا گھر تھا، اس لیے سب کی نظریں اس گھر پر ٹکی ہوئی تھیں۔

ابا جان نے کہا: ''آس پاس کے دیہات کے مسلمان میرے پاس پناہ کے لیے آئے ہیں، میں انھیں کیسے بلوائی سکھوں اور ہندوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اور اپنے بیوی بچوں کو لے کر چلا جاؤں؟'' ابا جان نے مزید کہا: ''عورتوں اور بچوں کی موجودگی میں بہادر سے بہادر مرد بھی بزدلی دکھا کر جان بچانے کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ عورتوں اور بچوں کے جانے کے بعد ہم عزتیں بچانے کی فکر سے تو آزاد ہو جائیں گے۔ باقی رہیں ہماری اپنی جانیں تو جو اللہ کو منظور ہوا وہی ہو گا، اس کی فکر نہ کریں۔''

اسی گومگو میں وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ فوجی جوان سیٹیوں پر سیٹیاں بجا رہے تھے۔ بالآخر ابا جان نے بڑے مستحکم لہجے میں اماں جان سے کہا:

''جب تک آخری آدمی یہاں سے پاکستان نہیں چلا جاتا، میں یہاں سے ہلوں گا بھی نہیں۔''

یہ سنتے ہی دادی اماں نے اپنا قرآن شریف گلے میں ڈالا، وضو کا لوٹا ہاتھ میں لیا اور اماں جان کے ساتھ بچوں کا ہاتھ پکڑ کر ستے ہوئے چہروں، بھنچے ہوئے ہونٹوں اور آنسوؤں سے لبریز آنکھوں کے ساتھ بس میں سوار ہو گئیں۔ جیسے ہی دادی اماں اور اماں جان بس میں بیٹھیں، باقی گھروں کی خواتین اور بچے بھی سوار ہو گئے۔ جب بسیں چلیں تو کچھ لوگ بے اختیار ہو کر ساتھ ساتھ دوڑنے لگے، لیکن ہم نے مڑ کر کھڑکی سے دیکھا تو ابا جان، چٹان کی طرح جمے اپنی جگہ پر خاموش کھڑے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

عصر اور مغرب کے درمیان یہ بسیں سرنا سے روانہ ہو کر عشا کے لگ بھگ امرتسر پہنچیں اور پوری رات وہاں کھڑی رہیں، کیونکہ اندھیرے میں سفر خطرناک تھا۔ آدھی رات کو دادی اماں حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے کے لیے سب کے روکنے کے باوجود اصرار کر کے بس سے اتر گئیں۔ جب خاصی دیر ہو گئی اور دادی اماں واپس نہیں آئیں اور سب لوگ مایوس ہو گئے تو اچانک ہم دیکھتے ہیں کہ دو سکھ دادی اماں کا ہاتھ پکڑے انہیں ساتھ لیے چلے آ رہے ہیں اور پوچھ رہے ہیں کہ اماں جی پہچانو، تہاڈی بس کیڑی ہے؟ ہم نے فوراً آواز دی۔ دادی اماں ادھر آ

جایئے۔ غرض دونوں سکھ سہارا دے کر اماں جی کو بس میں چڑھا کر سلام کر کے خاموشی سے واپس چلے گئے۔ ایک کے ہاتھ میں پانی کا بھرا ہوا لوٹا تھا، وہ بھی اس نے کھڑکی سے اماں جی کو پکڑا دیا۔ بعد میں دادی جان نے ہم سے کہا تم لوگ خواہ مخواہ سمجھتے ہو کہ سکھ مارتے ہیں حالانکہ مارنے جلانے والی ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔

ابا جان نے بطور احتیاط دارالاسلام ہی سے جماعت اسلامی کے ایک بزرگ محترم عبدالجبار غازی کو ہمارے قافلے کے ساتھ بھیجا اور ان کو یہ ہدایت کر دی تھی بسیں لے کر سیدھے گوال منڈی لاہور میں ملک نصر اللہ خان صاحب عزیز کے گھر چلے جائیں اور وہاں سے ہم لوگوں کو تانگے میں سوار کر کے اسلامیہ پارک پر فصیح منزل میں مولوی ظفر اقبال صاحب کے گھر پہنچا دے۔ اسی طرح ابا جان نے عبدالجبار غازی صاحب کو تاکید کر کے یہ بھی کہا کہ سب خواتین کو ان کے رشتہ داروں کے گھر پہنچا دیں۔ ہم فصیح منزل میں چند روز تک مقیم رہے۔ اس عرصہ میں ابا جان کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں آئی کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہیں؟ طلوع ہونے والا ہر دن دادی اماں اور اماں جان کے لیے ایک ایک صدی بن کر گزرتا تھا۔ ہر روز، ہر رات قیامت کی مانند ہوتی تھی۔ اس پورے عرصے میں مولوی ظفر اقبال صاحب کے گھر والوں نے جس طرح ہماری خاطر مدارات، دل جوئی اور علاج معالجے کے لیے سہولیات فراہم کیں، اس نے انصار مدینہ کی جانب سے مکہ کے وہاں حاضرین کی آؤ بھگت کی یاد تازہ کر دی اور پھر ایک دن اچانک ابا جان اپنے رفقاء کے ساتھ لاہور پہنچ گئے۔" (10-11)

[باقی]

محمد امین*

سید سلیمان ندوی
”شذرات سلیمانی“ کے آئینے میں

سید سلیمان ندوی ایک ہمہ جہت اور جامع شخصیت کے مالک تھے۔ ”عرب اور ہند کے تعلقات“ اور ”عربوں کی جہاز رانی“ میں وہ ایک بلند پایہ مورخ نظر آتے ہیں تو ”خیام“ میں ایک بلند پایہ ادیب۔ ”دروس الادب“ اور ”لغات جدیدہ“ لکھ کر اپنی عربی دانی کا لوہا منوایا تو اردو زبان میں مستعمل الفاظ کے ماخذ و مخارج پر مشتمل ان کی تحریریں اردو زبان کی ایک اہم خدمت تسلیم کی جاتی ہیں۔ سید صاحب کی جملہ تصانیف اور تحاریر پر ایک سرسری نظر بھی قاری کو یہ باور کرانے کے لیے کافی ہے کہ اپنے دور کے اہل علم اور اہل نظر میں اتنا تنوع اور کمالِ جامعیت رکھنے والا شخص خال خال ہی نظر آتا ہے۔

سید صاحب مرحوم کے فرزند ڈاکٹر سید سلمان ندوی لکھتے ہیں:

”یہ تسلیم ہے کہ سید صاحب جیسی متنوع شخصیت پر کام کرنا آسان نہیں اور کسی ایک شخص کے لیے مشکل ہے کہ ان کی بوقلمونیوں کو کماحقہٗ ایک جگہ سمیٹ سکے۔“[1]

لہٰذا میں نے بھی اپنی نااہلی اور لاعلمی کو مد نظر رکھتے ہوئے سید صاحب کے تمام پہلوؤں کو

* مصنف کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں ریسرچ اسکالر ہیں۔

[1]۔ علامہ سید سلیمان ندوی: شخصیت و ادبی خدمات، ڈاکٹر نعیم صدیقی 9۔

سمیٹنے کے بجاے صرف ایک پہلو کو اپنی اس تحریر کا موضوع بنایا ہے۔

سید سلیمان ندوی کی دیگر تصانیف کے متعلق جتنا اور جیسا کچھ لکھا گیا ہے اس کا عشر عشیر بھی ان کی صحافتی خدمات پر نہیں لکھا گیا۔ وجہ جو کچھ بھی ہو، لیکن ہے بہت افسوس ناک!

ویسے تو سید صاحب چار سال تک ''علی گڑھ'' منتھلی کا اردو حصّہ ایڈٹ کرتے رہے، ''الندوہ'' کے نائب ایڈیٹر بھی رہے، ''الہلال'' کی ادارت میں مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کے شریک بھی رہ چکے تھے، لیکن صحافت کے میدان میں ان کا اصل جوہر ''معارف'' میں ظاہر ہوا۔ رسالہ ''معارف'' کا آغاز جولائی 1916ء میں رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں ہوا۔ سید صاحب نے 1916ء سے 1950ء تک ''معارف'' کی ادارت کی ذمہ داری حسن و خوبی کے ساتھ خود سنبھالی۔ سید صاحب نے اس رسالے کو قدیم و جدید کے درمیان ایک پل کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ جولائی 1916ء کے شذرات میں اس وقت کی عام علمی و مذہبی فضا کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

> ''ملک میں اس وقت علم و مذہب کے متعلق جو خیالات بھی پھیلے ہوئے ہیں، وہ بالکل غیر معتدل ہیں، کچھ ایسے اشخاص ہیں جو عقل پرستی کے غرور میں مذہب اور مذہبی علوم کے ساتھ جاہلانہ تمسخر سے نہیں شرماتے، دوسری طرف حامیان مذہب و علوم کا جمہور اعظم ہے جو عقل و علم، مصالح و حکم، فلسفہ و اسرار کی ضرورت سے منکر ہے۔''[2]

آگے ''معارف'' کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ہماری جماعت صلح عام کی منادی ہے۔ وہ دونوں فریق کو مصالحت کی دعوت دیتی ہے، وہ جدید علوم، تازہ خیالات اور نئی تحقیقات کے بجان و دل سے قدر دان ہے لیکن اس کے لیے اپنے بزرگوں کا اندوختہ کھونا نہیں چاہتی ہے، یہ ان نادانوں پر ہنستی ہے جو تمام سرمایا دے کر بازار فرنگ کی ہر چمکتی ہوئی چیز کے خریدار بن جاتے ہیں لیکن ہماری جماعت ہر چیز کو خریدنے سے پہلے یہ جان لینا چاہتی ہے کہ یہ ہمارے بزرگوں کے تہ خانوں، خرابوں اور مدفون خزانوں میں موجود تو نہیں ہے، اگر ہے، تو وہ کون احمق ہوگا جو گھر کی ایک چیز کو چھوڑ کر اس کی تلاش

---

[2] ۔ شذرات سلیمانی 1/6۔

میں گلیوں اور بازاروں کی آوارہ گردی قبول کرے گا۔''

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ سید صاحب مرحوم نے ہمیشہ اسی اصول، اسی اسلوب کی پابندی کی، نہ قدامت پرستی کے عشق میں گرفتار تھے نہ جدیدیت کی زلفِ سیاہ کے اسیر تھے، بلکہ ہمیشہ اپنے لیے راہ اعتدال کا انتخاب کیا۔ اور ''معارف'' کو بھی اسی راہ پر گامزن رکھا۔ سید صاحب وقت کی نزاکت سے باخبر تھے، زمانے کی چال سے واقف تھے۔ وہ قدیم وجدید کے درمیان مجادلہ نہیں، بلکہ معانقہ کرانا چاہتے تھے۔ لیکن معانقے کی یہ راہ آسان بھی نہیں تھی۔ اپنے پرائے کے ہاتھوں مطعون ہونا پڑا۔ سید صاحب ہی کا جگر تھا جو اس پرخار راستے سے بہ سلامت گزر گئے۔ خود سید صاحب نے اپنی آبلہ پائی کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے، لکھتے ہیں:

''ملک میں قدیم وجدید تعلیم یافتوں کی دو برابر کی جماعتیں قائم ہیں، ہمارے کام کا پروگرام تو ایسا تھا کہ ان دونوں کے درمیان سلسلۂ اتصال کا کام دیتا لیکن کبھی کبھی ہم کو عجیب وغریب مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہی وقت ہوتا ہے جب ہمارے کانوں میں یہ آواز آتی ہے:

دو دل بودن دریں رہ سخت ترعیب است سالک را
نجل ہستم زکفر خود کہ دارد بوئے ایماں ہم

فریق اول کہتا ہے، کہ یورپ کے علوم کی آمیزش سے تم قدیم علوم کے حرم اقدس کی توہین کرتے ہو، جدید فرقہ الزام دیتا ہے کہ پرانے اور فرسودہ علوم کو زندہ کر کے تم ہمارے پاؤں میں وہی زنجیریں ڈالنا چاہتے ہو، جن کو پچاس برس کی محنت میں ہم نے مشکل سے کاٹا ہے۔''[3]

لیکن سید صاحب کی حقیقت شناس نظر نے دونوں فریقوں کو ان کی غلطیوں پہ متنبہ کیا اور اپنے مخصوص انداز میں انھیں حقیقت حال سے باخبر کیا۔ اور علمی اور فکری افراط و تفریط سے اجتناب کرتے ہوئے دونوں فریقوں کو باور کرانے کی کوشش کی کہ قدیم و جدید علوم ایک دوسرے کے لیے رکاوٹ نہیں، بلکہ ایک دوسرے کے لیے معاون ہیں۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ فریقین ایک دوسرے کی ضرورت کا احساس پیدا کریں۔ اسی احساس کو بیدار کرنے کی غرض سے سید صاحب لکھتے ہیں:

---

[3]۔ شذرات سلیمانی 1/11۔

”اصل یہ ہے کہ ہماری قوم کی مختلف ضرورتیں ہیں، ان میں سے کسی ضرورت کو کوئی بے سود نہیں کہہ سکتا، ہم کو طبیعات فلسفہ اور علم النفس کی بھی ضرورت ہے اور فقہ واصول و تفسیر کی بھی، اگر تم اپنے مذاق کے مطابق دنیا کا فیصلہ کرتے ہو تو اس کے یہ معانی ہوں گے کہ ایک طبیعی کے نزدیک نفسیات کا دلدادہ اتنا ہی احمق ہے، جتنا ایک فلسفی کی نگاہ میں ایک منقولی، حالاں کہ ہمیں دونوں کی ضرورت ہے اور ترمیم کے ساتھ ہم دونوں کے طالب ہیں۔“

سید صاحب نے واعظانہ اسلوب نگارش کے بجاے دوستانہ اور ہم دردانہ اسلوب اختیار کیا۔ اور اس کا انھیں فائدہ بھی ہوا۔ ان کی آواز کانوں کے پردوں سے ٹکرا کر واپس نہیں آئی، بلکہ کان کے راستے دل تک پہنچی، جیسا کہ مشہور مورخ، پروفیسر خلیق احمد نظامی نے اپنے مضمون ”مولانا سید سلیمان ندوی کے علمی کارناموں پر ایک نظر“ میں اس طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

”سید صاحب طبقۂ علما میں شاید پہلے شخص تھے جن کی علمی کاوشوں کو جدید اور قدیم دونوں مکتب خیال کے لوگوں نے یکساں عزت کی نگاہ سے دیکھا اور ان کی تحقیق کی ندرت، فکر کی جودت، اور دلائل کے استحکام کا لوہا مانا۔“[4]

”معارف“ شہرت اور قبولیت کی جس بلندی تک پہنچا اس کے پیچھے اس کے وہ اداریے تھے جو سید سلیمان ندوی نے 1916ء سے 1950ء تک ”شذرات“ کے نام سے لکھے۔ یہ شذرات اردو صحافت کی روایت میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو رسائل کے اکثر اداریے کے برخلاف سید صاحب کے شذرات پر سکّہ بند ہونے کا الزام نہیں لگ سکتا۔ اپنی نوعیت میں تازگی کا احساس دلانے والے ان شذرات نے ”معارف“ کے قاری کو 34 سال تک اپنا گرویدہ بنائے رکھا۔ ہم اسے سید صاحب کے شذرات کا اعجاز ہی سمجھتے ہیں کہ اتنے لمبے عرصے تک ”معارف“ کا قاری ذہنی تھکن کا شکار نہیں ہوا، بلکہ ہر لمحہ تازہ دم رہا۔ سید صاحب کے شذرات کی پذیرائی علمی حلقوں میں جس طرح کی گئی اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے ہو گا، اس وقت کے ایک بڑے صاحب علم، صاحب قلم، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم

---

[4]۔ حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی و دینی خدمات پر ایک نظر، سید صباح الدین عبد الرحمٰن۔

نے فرمایا کہ ''آپ (سید سلیمان ندوی) کے ''شذرات'' اور ''معارف'' کا وجود ''ندوۃ العلماء'' کی کامیابی پر برہان قاطع ہے۔''

ایک خاص اسلوب نگارش کے موجد اور خاتم مولانا ماجد دریابادی نے اپنے ہی انداز میں ''شذرات سلیمانی'' کے متعلق بیان فرمایا۔ لکھتے ہیں:

''صاحب معارف کی شذرات نگاری ایک خصوصی و امتیازی شانِ نگارش رکھتی ہے، بے لاگ لیکن نہ درشت نہ کرخت، عمیق لیکن نہ ادق نہ مغلق، رنگین لیکن نہ پر تکلف نہ ثقیل، سلیس، لیکن نہ سطحی نہ عامیانہ، شگفتہ لیکن نہ ناولانہ نہ خطیبانہ، جاندار لیکن نہ گرما گرم نہ پر خروش، صالح، لیکن نہ خشک نہ مولویانہ، سلیمانی ادب و انشا کا اردو کی تاریخ ادب و انشا میں جو ایک خاص مقام ہے... اس کی اصل بنیاد ہی معارف کے ادارتی صفحات سے پڑی اور معارف کے شذرات نے بہتوں کے لیے ایک نئی راہ کھولی۔''[5]

سید صاحب نے ان شذرات میں اپنے زمانے کے ہر اس مسئلے پر تبصرہ کیا ہے، جس کا تعلق مسلمانوں کی مذہبی و ملی زندگی سے تھا۔ خدا نے انھیں قوم و ملت کا سچا درد عطا فرمایا تھا۔ سید صاحب کی زندگی کا مطالعہ کرنے والا بہ خوبی جانتا ہے کہ ان کی پوری زندگی خصوصاً دو مقاصد کے لیے وقف تھی۔ ایک قوم و ملت کی خدمت اور دوسرا طلب علم کی سچی لگن۔ طلب علم کی خاطر وہ اپنی زندگی کی قیمتی سے قیمتی شے کو بھی قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ اس کی ایک نادر مثال شذرات ہی سے پیش کرتا ہوں۔ سید صاحب مارچ 1917ء کے شذرات میں اپنی بیماربیوی کے متعلق لکھتے ہیں:

''ایک عالم سے جب کہ وہ مطالعہ میں مصروف تھے، ان کی بی بی نے کہا کہ ''ایک نگاہ غلط انداز کی میں بھی مستحق ہوں''۔ بولے: ''دو سوکن ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں''۔ کتاب اور عورت دو سوکنیں ہیں، جو دماغ عورت کی زلف دراز سے الجھ جاتا ہے وہ کتاب کی سطریں نہیں گنتا، کیوں کہ گیسوئے پر خم میں جو سیاہی ہے وہ اس میں کہاں، لیکن سیاہ بخت کتابوں کی سطروں میں الجھ جاتے ہیں، ... مجھ بد قسمت کے ذمہ اللہ تعالیٰ نے مذہب اور علم دونوں کی خدمتیں

---

[5]۔ علامہ سید سلیمان ندوی: شخصیت و ادبی خدمات، ڈاکٹر نعیم صدیقی 388۔

تفویض کی ہیں، اس لیے بی بی کے معاملے میں مجھے ان متضاد فتوؤں نے عجیب کشمکش میں مبتلا کر رکھا ہے، میری اہلیہ جو ایک لڑکی اور ایک صغیر السن بچہ کی ماں ہیں، عرصہ آٹھ سال سے امراض مختلفہ میں علیل ہیں اور اب ڈاکٹر نے دق تجویز کیا ہے، اس لیے میں سخت پریشان ہوں ... ناظرین سے درخواست ہے، کہ وہ مذہبی حیثیت سے دعا کریں کہ خدا میرے سرمایۂ حیات کو میرے ہی پاس رہنے دے، لیکن اگر علمی خدمتیں سب کچھ لے کے اس کو بھی چھیننا چاہتی ہیں تو پھر وہی جو خدا کی مرضی ہے، میں ہر حال میں راضی برضائے الٰہی ہوں۔"

اللہ اللہ! خادمان علم و حکمت کے مجذوبانہ جذبوں کی کیسی کیسی حکایتیں اس دھرتی کے سینے میں دفن ہیں۔ بلاشبہ سید صاحب کا جذبۂ ایثار بھی انھی حکایات کا ایک تسلسل ہے۔ جب بندہ اپنے کسی جذبے میں سچا ہوتا ہے تو خدا بھی اس کے جذبے کی قدر کرتا ہے۔ سید صاحب اپنی بیمار بیوی کی زندگی میں غالب کا یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

میں بھی تمھیں بتاؤں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

اپنی اہلیہ مرحومہ کے انتقال پر سید صاحب اپنی دل سوز کیفیت کا ذکر کچھ یوں کرتے ہیں:

"اس پیکر وفا نے جان دے کر مجھے علم و ملت کی خدمت گزاری کے لیے کشاکشِ غم پنہاں سے فرصت عطا کی، لیکن ایسا کانٹا دل میں چبھ کر رہ گیا جو شاید عمر بھر نہ نکلے۔"

زمانہ سید صاحب کی طلب علم کی سچی لگن اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے علمی کارناموں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ آسمانِ علم و ادب میں سید صاحب جیسے لوگ ستاروں کی مانند ہوتے ہیں جن کی روشنی کبھی ماند نہیں پڑتی۔

سید سلیمان ندوی صاحب مسلمانانِ ہند کے علمی و فکری مسائل پر گہری حکیمانہ نظر رکھتے تھے۔ سید صاحب کی پوری زندگی مسلمانوں کی علمی اور فکری جمود کو توڑنے میں صرف ہوئی۔ قوموں کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب کبھی کوئی قوم ذہنی طور پر اپاہج ہو جاتی ہے تو اسی قوم کے اندر ایسے کچھ افراد ضرور پیدا ہوتے ہیں جن کی زندگی کا مشن ہی اپنی قوم کے اپاہج پن کو دور کرنا ہوتا ہے۔ ہماری ہند مسلم روایت میں بھی ایسے کئی لوگ پیدا ہوئے جن کی زندگیاں قوم کو قعرِ ذلت سے نکال کر بام عروج تک پہنچانے کی جد وجہد میں کٹ گئی۔ بلاشبہ ہمارے سید صاحب کا شمار بھی

انھی لوگوں کی جماعت میں ہوتا ہے۔ بلکہ بعض معاملات میں تو سید صاحب اس جماعت کی امامت کرتے ہوئے بھی نظر آتے ہیں۔

تاریخ اقوامِ امم کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ قومیں جب زوال کا شکار ہوتی ہیں تو ان کے اندر نفسیاتی طور پر کئی پیچیدگیاں جنم لے لیتی ہیں۔ انھی میں احساس کمتری اور احساس برتری کے نفسیاتی امراض بھی ہیں۔

بیسوی صدی کا مسلمان بھی ان دو خطرناک امراضِ نفسانی کا بری طرح شکار تھا۔ سید صاحب ایک طبیب حاذق کی طرح ان امراض کی دفع کی ہر ممکن کوشش میں لگے رہتے تھے۔ سید صاحب تشخیص اور علاج کی جن جزیات پر حکیمانہ نظر رکھتے تھے اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں خال خال نظر آتی ہے۔ ابھی اوپر ہم احساس کمتری اور احساس برتری جیسے امراض کا ذکر کر آئے ہیں۔ دوسری قوموں کی طرح مسلمانانِ ہند بھی احساس برتری یا احساس تفاخر کا شکار ہوئے اور اپنے تفاخر کے اظہار کے مختلف اسالیب بھی وضع کرنے لگے۔ ہم بطور واقعہ ''شذرات سلیمانی'' سے ایک اقتباس پیش کرنا چاہتے ہیں۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

> ''مولانا حالی مرحوم نے سر سید کی ایک ضخیم لائف کیا لکھ دی، کہ قومی بزرگی کا یہ ایک جزءلا ینفک قرار پا گیا کہ ہر محسن قوم کے حالات، واقعات، مدائح اور مناقب ایک کثیر الاوراق کتاب کی صورت ضرور چھپ جانے چاہیے، کسی شخص کی زندگی کو ایک پوری کتاب میں پھیلانے کے لیے صرف زندگی کی بڑائی اور عظمت کا ترانہ کافی نہیں، بلکہ اس میں گوناگوں واقعات، کثیر التعداد احوال، تاریخی مختلف الشیون حالات، مدوجزر اور نشیب و فراز کی کیفیات ملک و قوم کے انقلابات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر کسی بزرگ کی زندگی میں یہ سرمایہ ہاتھ نہ آسکے تو اس کی کوئی ضخیم اور کثیر الاوراق سیرت جس کو عرف عام میں سوانح عمری کہہ سکے، تیار نہ ہو سکے گی۔''

بادی النظر میں ایسا لگتا ہے کہ سید صاحب ایک علمی مسئلے میں قوم کی توجہ مبذول کرانا چاہ رہے ہیں، لیکن سید صاحب کی نظر بہت دور تک گئی ہے۔ دراصل مسلمانانِ ہند اپنے بڑوں کی مدح سرائی میں غیر محسوس طریقے سے اپنے جذبۂ تفاخر کو تسکین دے رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ عمل مسلمانوں کے لیے سخت نقصان دہ تھا، بلکہ غافل قوم کو تھپکیاں دے کر مزید سلانے کے مترادف تھا۔ لہٰذا سید صاحب نے اپنی بالغ نظری کا ثبوت دیتے ہوئے قوم کو اس فعل عبث پر متنبہ کیا۔

سید صاحب نے مسلمانوں کی ترقی اور تنزلی دونوں کے اسباب پر کافی غور و فکر کا مظاہرہ کیا ہے، انھوں نے عظمت رفتہ کے گیت سنا کر سینوں کو جہاں گرمایا ہے وہیں وقتِ ضرورت مسلمانوں کو ان کی تنزلی کے اسباب بھی بیان کیے ہیں۔ سید صاحب نے قوم و ملت کو علو ہمتی، استقامت اور جہد مسلسل کا سبق دینا اپنے شذرات کا نصب العین بنالیا تھا۔ ہم اپنی بات کی تصدیق کے لیے شذرات ہی سے کچھ حوالے پیش کرتے ہیں جو درج ذیل ہیں:

”مسلمانوں کی ترقی اور تنزلی دونوں کا ایک ہی سبب ہے اور وہ ہے ان کا فوری اور وقتی جوش، وہ سیلاب کے مانند پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہلا سکتے ہیں لیکن کوہ کن کی طرح ایک ایک پتھر جدا کر کے راستہ صاف نہیں کر سکتے... وہ ایک مسجد کی مدافعت میں اپنا خون پانی کی طرح بہا سکتے ہیں، لیکن ایک منہدم مسجد کو دوبارہ بنانے کے لیے مسلسل کوشش جاری نہیں رکھ سکتے۔“

”ہماری ناکامی کا اصل سبب کیا ہے، یہ ہے، کہ ہم آندھی کی طرح آتے ہیں اور بجلی کی طرح گزر جاتے ہیں، ہم کو دریا کے اس پانی کی طرح ہونا چاہیے، جو آہستہ آہستہ بڑھتا ہے اور سالہا سال میں کناروں کو کاٹ کر اپنا دہانہ وسیع کرتا جاتا ہے۔ کامیابی صرف مسلسل اور پائیدار کوشش میں ہے۔“

”ہم نے کہا ہے اور پھر کہتے ہیں، کہ مسلمان دم میں جل جانے والے اور جلا دینے والے کوہ آتش فشاں ہیں، لیکن ہمیشہ سلگنے والے اور جلتے رہنے والے آتش کدہ نہیں، وہ ایک لمحے کے آنے والے اور گزر جانے والے طوفان آب ہیں لیکن ہمیشہ بہنے والے ہمالیہ کی برفشانی چوٹیوں کے چشمے نہیں۔“

”مسلمانوں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ کل کا مقابلہ میدان جنگ میں تیغ و خنجر کے ذریعے سے تھا،... لیکن آج مقابلہ کا میدان دوسرا ہے، آج امن و سلامتی اور خاموشی کے ساتھ ہندوستان کے گاؤں گاؤں اور گلی گلی میں شدھی اور سنگھٹن کا جال پھیلایا جا رہا ہے،... اس کے لیے غور و فکر، مسلسل جد و جہد، ہوشیاری و بیداری اور کام اور عمل کی ضرورت ہے۔“

سید سلیمان ندوی صاحب کے متعلق اس مضمون میں جن اوصاف کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا گیا ہے، ان کے علاوہ بھی کئی ایسی خوبیاں ہیں جو سید صاحب میں بدرجۂ کمال و تمام پائی جاتی ہیں۔ جی تو یہی چاہتا ہے کہ اپنی نا اہلی کے باوجود ان تمام اوصاف کو قلم بند کروں، لیکن سید

صاحب جیسی عبقری شخصیت کو اس چھوٹے سے مضمون میں قید کرنا سمندر کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہو گا۔ اللہ سے دعا گو ہوں کہ مجھے اتنی فرصت اور ہمّت عطا ہو کہ سید صاحب پر ویسا لکھ سکوں، جیسا ان پر لکھنے کا حق ہے۔

خیال و خامہ

جاوید احمد غامدی

رہتی ہے اگر گردشِ دوراں کوئی دن اور
دیکھیں گے یہی آدم و یزداں کوئی دن اور

شاید اِسی فرمان پہ قائم ہے جہاں اب
رہنے دو اِسے دست و گریباں کوئی دن اور

تہذیب کی یلغار میں ہے یہ بھی غنیمت
ناچار ہی رہ جائیں مسلماں کوئی دن اور

تیرہ ہیں مہ و مہر تو ہم اپنے لہو سے
کر دیتے ہیں یہ بزم چراغاں کوئی دن اور

بڑھتا ہی رہا درد ستم گر کی دوا سے
کیا خوب تقاضا ہے کہ درماں کوئی دن اور

ہوتی ہے اگر گرمیِ محفل کی تمنا
کر لیتے ہیں تنہائی کو مہماں کوئی دن اور

اِس دور میں سرمایۂ اربابِ نظر بھی
اب ہو گا فراہی کا دبستاں، کوئی دن اور

حالات و وقائع

اِسی فقیر کا یہ حلقۂ سخن ہے جہاں
عجب نہیں کہ ہوں فطرت کے رازداں پیدا

شاہد محمود

خبرنامہ ”المورد امریکہ“

[فروری 2025ء]

”مسئلۂ فلسطین اور مذہبی قیادت کا کردار“

حسن الیاس صاحب نے اپنے اس مضمون میں مسئلۂ فلسطین کے حوالے سے ہماری مذہبی قیادت کے بیانیے پر نقد کرتے ہوئے اس کی خامیوں اور مسلم دنیا پر اس کے خطرناک اثرات کو بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ مسئلۂ فلسطین بنیادی طور پر ایک سیاسی اور جغرافیائی تنازع تھا، جس کو ہماری مذہبی قیادت نے ایک خاص زاویے سے پیش کرتے ہوئے ایک مذہبی مسئلہ بنا دیا ہے، جس کے نتیجے میں مسلم دنیا کو خوں ریزی، سیاسی عدم استحکام اور معاشی مشکلات جیسے سنگین مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ مزید برآں، فلسطینی قیادت کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے مسئلۂ فلسطین کے حل کے لیے اہم نکات بھی بیان کیے ہیں۔ اس مضمون کو ”اشراق، امریکہ“ کے جنوری 2025ء کے شمارے میں دیکھا جا سکتا ہے۔

”موت کی سزا“ کے موقف پر اعتراضات کا جائزہ

گذشتہ ماہ غامدی سینٹر کے زیر اہتمام جاری 23 اعتراضات کی ویڈیو سیریز کے تحت منعقد

ہونے والی نشستوں میں ”موت کی سزا“ کے بارے میں غامدی صاحب کے نقطۂ نظر پر کیے جانے والے اعتراضات کو زیر بحث لانے کے ساتھ ساتھ غامدی صاحب نے اپنے موقف کی توضیح میں مزید اہم نکات پر بھی گفتگو کی۔ ان نشستوں میں زیر بحث آنے والے چند اہم اعتراضات اور نکات یہ ہیں: فقہا کا استدلال“، ”احادیث میں قتل کی سزا“، ”قتل نفس کا قانون“، ”فساد فی الارض کے اطلاقات“، ”قحبہ گری کی سزا کا مردوں پر اطلاق کیوں؟“ اور ”احادیث میں رجم کی سزا“۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھا جا سکتا ہے۔

”عالمی دعوت“

غامدی صاحب کا یہ مضمون اسلام کی عالمی دعوت کے تین مراحل کا بیان ہے۔ لکھتے ہیں کہ پہلے مرحلے میں یہ دعوت سب سے پہلے آدم علیہ السلام کے ذریعے سے خود اُن کو اور اُن کی اولاد کو دی گئی تھی۔ دوسرے مرحلے میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور اُن کی اولاد کو اس کے لیے منتخب کیا گیا اور بنو اسحٰق کم و بیش پندرہ سو سال تک اس ذمہ داری کے منصب پر فائز رہے، مگر جب اُنھوں نے یحییٰ علیہ السلام کو قتل کر ڈالا اور پھر سیدنا مسیح کو بھی قتل کر دینے کے درپے ہوئے تو ان کو اِس عظیم ذمہ داری سے معزول کر دیا گیا اور یہ ذمہ داری بنی اسمٰعیل کے سپرد کر دی گئی۔ چنانچہ اِسی مقصد سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، جس کے نتیجے میں اسلام کی عالمی دعوت کا تیسرا اور آخری مرحلہ شروع ہوا۔ یہی مرحلہ اِس وقت جاری ہے۔ یہ مضمون ماہنامہ ”اشراق، امریکہ“ کے گذشتہ ماہ کے شمارے میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

”کیا عقل خدا کے وجود کو ثابت کر سکتی ہے؟“

غامدی سینٹر نے جاوید احمد غامدی صاحب کی تمام ویڈیوز کو اے آئی کی مدد سے انگریزی زبان میں ڈب کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے تاکہ انگریزی جاننے والے حضرات بھی غامدی صاحب کے افکار و نظریات سے مستفید ہو سکیں۔ جنوری 2025ء میں ”کیا عقل خدا کے وجود کو ثابت کر سکتی ہے؟“ کے موضوع پر تین لیکچرز کو انگریزی زبان میں ڈب کر کے غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر نشر کیا گیا ہے۔

"My Discovery of God, Islam & Judgement Day" کا اردو ترجمہ

یہ حمزہ علی عباسی صاحب کی تصنیف ہے، جو غامدی سینٹر کے زیر اہتمام شائع ہو چکی ہے اور اسے دنیا بھر میں بہت پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔ اس کتاب میں حمزہ علی عباسی صاحب نے اپنے اس سفر کو تفصیل سے بیان کیا ہے، جس میں انھوں نے اسلام کے حوالے سے بہت سی غلط فہمیوں کے دور ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اسلام کے بارے میں رائج بہت سے غلط تصورات کو سمجھنے کے لیے جدید ذہن کو اس کتاب سے بہت مدد ملی ہے۔ غامدی سینٹر نے اس کو اردو زبان میں بھی شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ مکمل ہو گیا ہے۔ یہ کتاب اشاعت کے مراحل میں ہے اور جلد ہی اردو قارئین کے لیے بھی دستیاب ہو گی۔

"23 اعتراضات سیریز کا پس منظر"

گذشتہ ماہ حسن الیاس صاحب نے رضوان علی صاحب کے ساتھ ایک پوڈکاسٹ ریکارڈ کرایا، جس میں انھوں نے "23 اعتراضات سیریز" کے پس منظر، مقصد اور اثرات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اس سیریز سے ہمارا مقصد روایتی مکاتبِ فکر کے خلاف کوئی جنگ جیتنا نہیں، بلکہ اللہ کے دین کے ادنیٰ خادم کی حیثیت سے اس پر غور و فکر کرنا ہے۔ مزید برآں، غامدی صاحب کے کام کے حوالے سے انھوں نے بیان کیا کہ غامدی صاحب کے کام کا مقصد صرف علم اور سچائی کی تلاش ہے، نہ کہ اپنے استدلال اور نتیجۂ فکر سے معاشرے میں کوئی تبدیلی رونما کرنا۔ اس پروگرام کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

"وائس آف ریسرچ"

"وائس آف ریسرچ" کے نام سے غامدی سینٹر کے حال ہی میں شروع کیے گئے آن لائن سیمینارز کا سلسلہ جاری ہے۔ ان سیمینارز میں محققین اور اسکالرز اپنی تحقیق پیش کرتے ہیں۔ اس سیمینار کا مقصد تحقیقی مزاج، مکالمے کے فروغ اور تنقیدی سوچ کے ذریعے سے تحقیقی ماحول پیدا کرنا ہے۔ گذشتہ ماہ دو سیمینارز کا انعقاد ہوا۔ ایک کا عنوان "زکوٰۃ اور جدید معیشت" تھا، جس پر ڈاکٹر سلمان احمد شیخ صاحب نے گفتگو کرتے ہوئے فقہ الزکوٰۃ کا جدید معیشت پر اطلاق، سرمایے

کی جدید شکلوں میں زکوٰۃ کا اطلاق، پیداوار کی جدید شکلوں میں عشر کا اطلاق اور مصارف زکوٰۃ اور جدید معیشت میں ریاست کا کردار جیسے اہم نکات پر بات کی۔ دوسرے سیمینار کا موضوع ''کیا قرآن مجید سائنس کی کتاب ہے؟'' تھا۔ اس کے مقرر ڈاکٹر اشفاق احمد صاحب تھے، جنھوں نے ''علم القرآن کیا ہے؟''، ''ہم قرآن مجید اور سائنس میں مطابقت کیسے پیدا کریں؟'' اور ''مغربی دنیا سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں مسلم دنیا سے کیسے آگے بڑھی؟'' جیسے اہم سوالات پر بات کی۔ ان سیمینارز کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

''ایمانیات میں کیا شامل ہے اور کیا شامل نہیں ہے؟''

مدیر ''اشراق، امریکہ'' سید منظور الحسن صاحب کا یہ مضمون ایمانیات کے حوالے سے غامدی صاحب کے موقف کا بیان ہے۔ لکھتے ہیں کہ دین میں صرف پانچ چیزوں کو ایمان و عقیدے کی حیثیت حاصل ہے اور وہ اللہ، اُس کے فرشتوں، اُس کی کتابوں، اُس کے رسولوں اور آخرت کے دن پر ایمان ہے۔ اِن کے علاوہ دیگر اجزاے دین کو ایمانیات کے زیرِ عنوان بیان کرنا درست نہیں ہے۔ بیان کرتے ہیں کہ قرآن مجید کے محل تدبر مندرجات کو ایمانیات کے زمرے میں شامل کرنے سے علمی لحاظ سے دو اہم مسئلے پیدا ہوتے ہیں: ایک، ایمانیات کا دائرہ محل بحث میں آ جاتا ہے۔ دوسرے، اخبار و اطلاعات کی نوعیت کی چیزوں کو ایمان کا درجہ دینے سے اُن کے بارے میں غور و فکر اور اختلاف راے کا جواز ختم ہو جائے گا۔ یہ مضمون جنوری 2005ء کے شمارے میں پڑھا جا سکتا ہے۔

''تفہیم الآثار'' سیریز

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام ''تفہیم الآثار'' سیریز کے زیر عنوان گذشتہ ماہ منعقد ہونے والے پروگراموں میں قرآن مجید کے حوالے سے مختلف آثار کا مطالعہ کیا گیا، جن میں ''غیر مسلم کو قرآن کی تعلیم دینا''، ''قرآن مجید سے علاج کرنا''، ''دینی اور اخلاقی تربیت کے بغیر قرآن مجید سیکھنے کے مفاسد''، ''قرآن مجید کو حصول دنیا کا ذریعہ بنانا'' اور ''حاملین قرآن کی سیرت و کردار'' جیسے اہم نکات پر گفتگو کی گئی۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

سہ ماہی ”اشراق امریکہ“ کا انگریزی شمارہ

”غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ“ کی تمام علمی اور دعوتی سرگرمیاں ابلاغ کے جدید ذرائع کو مد نظر رکھتے ہوئے انجام دی جاتی ہیں۔ موجودہ دور میں انگریزی زبان کو عالمی سطح پر ذرائع ابلاغ کے لیے ایک اہم ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ انگریزی زبان کی اس اہمیت کے پیش نظر ”اشراق امریکہ“ کو انگریزی میں بھی شائع کیا جاتا ہے تاکہ انگریزی جاننے والوں کی ایک بڑی تعداد بھی مدرسۂ فراہی کے علمی اور فکری لٹریچر سے مستفید ہو سکے۔ نومبر 2024ء تا جنوری 2025ء کا شمارہ گذشتہ ماہ شائع کیا گیا، جسے غامدی سینٹر کی ویب سائٹ پر دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ مجلہ عابد محمود ہاشمی صاحب کی ادارت میں شائع ہوتا ہے، جب کہ جناب مکرم عزیز، اعجاز الحق صاحب، جناب محمود الرشید، مالک الٰہی صاحب اور جناب محمد عمار اس کی اعزازی مجلس ادارت میں شامل ہیں۔

”گریٹر اسرائیل اور شکست خوردہ مسلمان“

یہ غامدی سینٹر کے ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ کمونیکیشن محمد حسن الیاس صاحب کے پوڈکاسٹ کا عنوان ہے، جو انھوں نے میزبان باسط ندیم صاحب کے ساتھ ریکارڈ کرایا۔ حسن الیاس صاحب نے اس میں مسئلۂ فلسطین سے متعلق میزبان کے سوالات کے جواب دیتے ہوئے حماس کے منشور اور بیانیے کو تفصیلاً بیان کیا اور حماس کے اسرائیل پر حملے کی وجوہات بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے نہتے شہریوں کو یرغمال بنانے کے اقدام کی مذمت بھی کی۔ مزید برآں، اس پروگرام میں ضمنی طور پر کچھ اہم نکات کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے، جو یہ ہیں: ”کیا حدیث کے بغیر دین مکمل ہے؟“، ”غامدی صاحب پر لگنے والے اعتراضات کی حقیقت“ اور ”اسلامک ڈیموکریسی اور ایل جی بی ٹی کمیونٹی“۔ اس پوڈکاسٹ کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہے۔

غامدی سینٹر کی آن لائن خانقاہ

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام جاری آن لائن خانقاہ میں معز امجد صاحب ہر ہفتے اصلاحِ نفس کے پہلو سے ایک نشست منعقد کرتے ہیں، جس میں لوگوں کے نفس کی اصلاح اور تربیت کے حوالے

سے مختلف موضوعات کو زیر بحث لایا جاتا ہے اور اس سے متعلق لوگوں کی طرف سے پوچھے گئے سوالوں کے جواب دیے جاتے ہیں۔ گذشتہ ماہ اس سلسلے کی منعقد ہونے والی نشستوں میں زیر بحث آنے والے چند اہم نکات یہ ہیں: ''انسان کا شعور اور خود آگہی''، ''انسان کی سات منفرد صلاحیتیں''، ''یونیورسل اخلاقیات کے باوجود اختلاف کیوں؟'' اور ''ہم کیسے زندہ ہیں؟''۔ آن لائن خانقاہ کی ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جاسکتی ہے۔

سہ ماہی ''صالحات'' کا تیسرا شمارہ

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام خواتین کے لیے شائع ہونے والے سہ ماہی میگزین ''صالحات'' کا تیسرا شمارہ منظر عام پر آچکا ہے۔ اس کا آڈیو اور پی ڈی ایف ورژن آن لائن دستیاب ہے۔ اس شمارے میں خواتین کی دل چسپی کی علمی و ادبی اور تاریخی تحریریں اور انٹرویو شامل کیے جاتے ہیں۔ اس شمارے میں شائع ہونے والے چند اہم مضامین کے موضوعات یہ ہیں: ''نکاح اور حق مہر کی حقیقت''، ''عدت اور اس کے مسائل''، ''غلطی ہاے مضامین مت پوچھ''، ''ہمارے بزرگوں کا تصور عبادت'' اور ''بچوں کی تربیت کے چند اہم پہلو''۔ یہ نعیم بلوچ صاحب کی ادارت میں شائع کیا جاتا ہے، جب کہ وجیہہ حسان واحدی اس کی نائب مدیر ہیں۔

''سوال و جواب حسن الیاس کے ساتھ''

غامدی سینٹر کے ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ کمیونیکیشن حسن الیاس صاحب نے گذشتہ ماہ معروف یوٹیوب چینل ''مسلم ٹوڈے'' کو انٹرویو دیا۔ یہ بنیادی طور پر غامدی صاحب کے فکر کے حوالے سے سوال و جواب پر مبنی پروگرام تھا، جس میں حاضرین کی جانب سے مختلف سوالات پوچھے گئے۔ مزید برآں، حدیث و سنت کے باہمی تعلق، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی تفہیم کے حوالے سے خوارج کے نقطۂ نظر اور صحابۂ کرام کے درمیان سیاسی تنازعات سے متعلق سوالات بھی پوچھے گئے اور حسن الیاس صاحب نے ان کے تسلی بخش جواب دیے۔ اس پروگرام کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

''البیان'' کی انگریزی زبان میں تدریس

گذشتہ ماہ شہزاد سلیم صاحب نے غامدی صاحب کی تفسیر ''البیان'' میں سے سورۂ نساء کی آیات 60 تا 103 کا انگریزی زبان میں درس دیا۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

مولانا اصلاحی کے علمی کام کا تعارف

نعیم احمد بلوچ صاحب نے ''حیات امین'' کی گذشتہ ماہ شائع ہونے والی قسط میں مولانا اصلاحی کی جماعت اسلامی سے وابستگی کے دوران میں علمی کام کا تعارف پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ جماعت اسلامی کے ساتھ 17 برس کی رفاقت میں مولانا اصلاحی نے جماعت کا علمی محاذ سنبھالے رکھا۔ اس زمانے میں مولانا کے قلم سے معرکۃ الآرا علمی مقالات اور مضامین سامنے آئے۔ یہ سب جماعت کے ترجمان ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' میں شائع ہوئے۔ مزید برآں، مولانا اصلاحی کے اس کام کو تین اقسام میں تقسیم کرتے ہوئے ان کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔

''اسلام اسٹڈی سرکل''

جنوری 2025ء میں شہزاد سلیم صاحب نے ''اسلام اسٹڈی سرکل'' پروگرام میں قرآن مجید، حدیث اور بائیبل کے جن موضوعات پر بات کی، ان کے عنوانات بالترتیب یہ ہیں: ''دین کی حمایت''، ''شکر گزاری'' اور ''زبان کو قابو میں رکھنا''۔ مزید برآں، نشست کے آخر میں ''ایمان داری'' کے موضوع پر گفتگو کی گئی اور زیر بحث آنے والے موضوعات سے متعلق پوچھے جانے والے سوالوں کے جواب دیے گئے۔ اس نشست کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

غامدی صاحب کی ہفتہ وار سوال وجواب کی نشستیں

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام ہر ہفتے سوال وجواب کی لائیو نشست منعقد کی جاتی ہے، جس میں حسن الیاس صاحب غامدی سینٹر کو موصول ہونے والے مختلف نوعیت کے سوال غامدی صاحب

کے سامنے رکھتے ہیں اور غامدی صاحب ان کا جواب دیتے ہیں۔ جنوری 2025ء میں منعقد ہونے والی ان نشستوں جن سوالوں کو زیر بحث لایا گیا، وہ یہ ہیں: ''کیا دین کا مقصد تہذیبی برتری ہے؟''، ''روایت کا کیا مفہوم ہے؟''، ''روایت کے مصداقات کیا ہیں؟''، ''کیا فکر فراہی روایت کے اندر کھڑی ہے؟'' اور ''کیا تہذیبی روایت طاقت کے بغیر حاصل ہو سکتی ہے؟'' مزید برآں، مسلمانوں کی تاریخ اور اسلام کی تاریخ کے فرق کو بھی واضح کیا گیا۔ سوال و جواب کی ان نشستوں کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

''اصل الاصول''

جنوری 2025ء میں شہزاد سلیم صاحب نے ''میزان لیکچرز سیریز'' کے تحت ''اصل الاصول'' کے موضوع پر انگریزی زبان میں دو لیکچرز ریکارڈ کرائے۔ ان لیکچرز کی ریکارڈنگ کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھا جاسکتا ہے۔

''علم و حکمت: غامدی کے ساتھ''

گذشتہ ماہ ''دنیا نیوز'' پر نشر ہونے والے غامدی صاحب کے ہفتہ وار پروگرام میں ''غامدی صاحب کے تصور سنت پر اشکالات کا جائزہ'' کے عنوان سے تین اور ''مکتبِ فراہی کے فکری حاصلات'' کے موضوع پر ایک پروگرام نشر ہوا۔ ان پروگراموں میں زیر بحث آنے والے سوالوں میں سے چند اہم سوالات یہ ہیں: ''موجودہ دور میں سنت کی تصدیق کا عمل کیسے ہو گا؟''، ''ملت اور سنت میں کیا فرق ہے؟''، ''سنت سے مراد عملی طریقہ لینا ہی کیوں ضروری ہے؟''، ''کیا یہود و نصاریٰ کے ہاں بھی ابراہیمی سنتیں پائی جاتی ہیں؟'' اور ''فکر فراہی نے روایتی دینی فکر میں موجود اشکالات کو کیسے دور کیا ہے؟'' ان پروگراموں کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جاسکتی ہے۔

23 اعتراضات کی ویڈیو سیریز کا انگریزی زبان میں خلاصہ

شہزاد سلیم صاحب 23 اعتراضات کی ویڈیو سیریز میں اب تک کے زیر بحث آنے والے تمام

موضوعات کا انگریزی زبان میں خلاصہ بیان کر رہے ہیں۔ گذشتہ ماہ شہزاد سلیم صاحب نے 23 اعتراضات کی سیریز میں زیر بحث آنے والے موضوع ''غنا اور موسیقی'' کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے دو لیکچرز ریکارڈ کرائے۔ ان پروگرامز کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جاسکتی ہے۔

دینی آرا پر مبنی فتاویٰ کا اجرا

شریعت کے قانونی اطلاقات کے حوالے سے لوگ اکثر غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، امریکہ سے رابطہ کرتے ہیں۔ انھیں نکاح و طلاق، وراثت (inheritance) اور بعض دیگر معاشی اور معاشرتی پہلوؤں سے اطلاقی آرا کی ضرورت ہوتی ہے۔ گذشتہ ماہ اسی نوعیت کی مختلف ضرورتوں کے تحت 2 فتوے جاری کیے گئے۔ انھیں جناب جاوید احمد غامدی کے فکر کی روشنی میں حسن الیاس صاحب نے جاری کیا۔

شہزاد سلیم صاحب کے آن لائن نجی مشاورتی سیشن

شہزاد سلیم صاحب ہر ماہ لوگوں سے آن لائن نجی مشاورتی سیشن کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان سیشنز میں لوگ اپنے مختلف ذاتی اور خاندانی نوعیت کے مسائل میں شہزاد سلیم صاحب سے مشاورت کرتے ہیں۔ گذشتہ ماہ اس سلسلے کے 30 سے زائد سیشنز ہوئے۔ ان سیشنز میں لوگوں نے شہزاد سلیم صاحب سے والدین کو درپیش مشکلات اور نوعمری کے مسائل کے حل کے لیے مشاورت کی۔

Ask Dr. Shehzad Saleem

یہ سوال و جواب کی لائیو ماہانہ نشست ہے، جس میں ڈاکٹر شہزاد سلیم لوگوں کے ذہنوں میں اٹھنے والے مختلف دینی، اخلاقی اور معاشرتی موضوعات سے متعلق سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ اس نشست میں لوگ اردو اور انگریزی، دونوں زبانوں میں اپنے سوال پوچھ سکتے ہیں۔